۲۵۔ Long Worth Dames, M (1907) Popular Poetry of the Baloches, Londdon, Folk Lore Society, David Nutt, 57-59 Long Acre.

۲۶۔ A. H. Diack (3rd March 1998) Gazetteer of the Dera Ghazi Khan District 1893-97, Revised Edition, Lahore, Civil and Military Press,

اخبارات ورسائل:

۱۔ ماہنامہ ''اُلس بلوچی''، اگست، ستمبر ۲۰۰۸ء، اسلام آباد۔

۲۔ ''بولان نامہ''، ۱۱ر جون ۱۹۶۷ء، کوئٹہ۔

۳۔ ماہنامہ ''ڈیفینس ڈائجسٹ''، راول پنڈی، ستمبر ۱۹۹۰ء۔

۴۔ روزنامہ ''جنگ'' سنڈے میگزین، ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء۔

۵۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر (حصہ اوّل) مجلس ترقی ادب، شمارہ ۶۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء، لاہور۔

دستاویزات:

۱۔ اللہ بخش قیصرانی: ۱۹۸۸ء، ''غیر مطبوعہ بلوچی کلام''، ڈیرہ غازی خان، بلوچی تحقیق مرکز، مخطوطہ نمبر ۹۶۔

۲۔ بلوچ اراضیاتی دستاویزات، ۲۰ر فروری ۱۹۰۲ء، ''مخزونہ''، بلوچی تحقیقی مرکز، ڈیرہ غازی خان، مخطوطہ نمبر ۶۶۷۔

۳۔ تمسکاتِ اراضی جدی قیصرانی: ۱۹۰۵ء۔۱۹۳۵ء، ''مخزونہ''، بلوچی تحقیق مرکز ڈیرہ غازی خان، مخطوطہ نمبر ۶۶۶۔

۴۔ جرگہ داستانہ: ۲۹۔۱۹۲۸ء، ''مخزونہ''، بلوچی تحقیق مرکز، ڈیرہ غازی خان، مخطوطہ نمبر ۹۷۔

۵۔ شجرہ نسب بندوبست قانونی سال ۱۸۷۲ء موضع کوت قیصرانی، تحصیل سنگھڑ، ضلع ڈیرہ غازی خان، ریکارڈ، نقول برانچ۔

۶۔ صاحب کھوہ سغ: ۱۹۸۴ء، ''کہن عیں بلوچی شاعری''، غیر مطبوعہ، ڈیرہ غازی خان، بلوچی تحقیق مرکز، مخطوطہ نمبر ۸۵۔

۷۔ عبدالقدیر علوانی: ۲۰۰۴ء، ''غیر مطبوعہ بلوچی کلام''، ڈیرہ غازی خان، بلوچی تحقیق مرکز، مخطوطہ نمبر ۵۹۶۔

۸۔ قدیم قبائلی دستاویزات: ''مخزونہ''، بلوچی تحقیق مرکز ڈیرہ غازی خان، مخطوطہ نمبر ۶۶۵۔

۹۔ کریم بخش پروانہ: ۱۹۷۸ء، ''غیر مطبوعہ بلوچی کلام''، ڈیرہ غازی خان، بلوچی تحقیق مرکز، مخطوطہ نمبر ۶۔

محمد اعجاز صابر
سیّد جاوید اقبال

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دیباچوں کا تجزیاتی مطالعہ

سیّد دلدار علی علمی و ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام، فرمان فتح پوری سے جانے جاتے ہیں، ہندوستان کی ریاست، اتر پردیش کے ضلع فتح پور، ہسوہ میں ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے بھرپور علمی و ادبی زندگی بسر کرنے کے بعد ۳ر اگست ۲۰۱۳ء کو کراچی میں وفات پائی۔ ان کی باسٹھ (۶۲) کے لگ بھگ کتابیں شائع ہوئیں، جن میں دو انگریزی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے سات کتابوں کے ایڈیشن پاکستان کے علاوہ ہندوستان سے بھی شائع ہوئے اور بعض کتابیں برصغیر کی جامعات میں گریجویشن سے ڈاکٹریٹ تک کے اُردو نصاب میں شامل ہیں۔ بیش تر کتابیں اُردو زبان و ادب کی تحقیق میں حوالے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اُردو رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے اور بعد میں مجموعۂ مضامین کی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصانیف اُردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء، اُردو کی منظوم داستانیں، نواب مرزا شوق کی مثنویاں، دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ، اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری اور ہندی اُردو تنازع اپنے موضوعات کے حوالے سے اُردو تحقیق میں اضافہ ہیں۔

ان کی نثر نگاری کا ایک رخ دیباچے ہیں جس میں وہ اُردو زبان و ادب کے اہم پہلوؤں کو زیر بحث لائے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے انھی دیباچوں کا فکری و فنی مطالعہ اس مقالے کا مقصد ہے۔ لیکن اس سے قبل ادب میں دیباچہ نگاری کے مفہوم، مشاہیرِ ادب کی آرا، اُردو میں اس کی روایت اور ڈاکٹر فرمان کی دیباچہ شناسی کا اجمالی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

کسی موضوع پر کوئی تخلیقی، تحقیقی یا تنقیدی کام کتابی صورت میں شائع ہوتا ہے، تو صاحبِ کتاب، ابتدائی صفحات میں تعارفی، معلوماتی یا تنقیدی خیالات اور تاثرات سے قاری کو آگاہ کرنا چاہتا ہے تاکہ کتاب کے باقاعدہ مطالعے سے قبل قاری موضوع سے متعارف ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ خود قلم اٹھاتا ہے یا پھر اس موضوع کے کسی فاضل سے رابطہ کرتا ہے، جو اس کتاب کے مطالعے کے بعد اپنی رائے لکھ دیتا ہے۔ مصنف اس رائے کو اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں شامل کر دیتا ہے۔ اس رائے کو پیش لفظ، دیباچہ یا مقدمہ کہا جاتا ہے۔

''دیباچہ'' اُردو زبان میں لفظ ''دیبا'' کی تصغیر ہے۔ دیبا سے مراد ریشمی قسم کے کپڑے کے ہیں، جس پر موتی ٹنکے ہوں اور ''دیباچہ'' سے مراد رخسار، پیشانی، آغاز نما اور مقدمۂ کتاب کے ہیں۔[1] ''فیروز اللغات'' میں، دیباچہ کے معنی ''کتاب کا مقدمہ، پیش لفظ، تمہید اور آراستہ درج ہیں۔''[2]

انگریزی زبان میں اس کے لیے "Foreword" اور "Preface" کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ "Foreword" کے اُردو معنی ''پیش لفظ، آغاز کلام، کسی کتاب کا دیباچہ، جسے مصنف کے علاوہ کسی اور نے لکھا''، دیے گئے ہیں۔[3] "Preface" کے اُردو معنی دیباچہ، تمہید، افتتاحیہ، مقدمہ''[4] دیے گئے ہیں۔

Webster,s 1913 Dictionary میں ''Foreword'' کی تعریف یہ ہے:

"Foreword - a short introductory essay preceding the text of a book"(5)

جب کہ Preface کی تعریف اس طرح ملتی ہے:

" Something spoken as introductory to a disclosure , or written as introductory to a book or essay ; a poem; an introduction, or series of preliminary remarks."(6)

دیباچہ نگاری، ''تقریظ'' کی ترقی یافتہ شکل ہے، جس کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ'' زمانۂ قدیم کے عرب شعرا بازار عکاظ کے میلے میں جمع ہو کر اپنا اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ صدرِ محفل کلام سُن کر کلام کی اچھائیوں اور خوبیوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ ایک شاعر کے کلام کا تقابل دوسرے شاعر کے کلام سے کرتے تھے۔ اس عمل کو'' تقریظ کہا جاتا تھا۔''[5] ایک عرصے تک لفظ ''تقریظ'' عرب میں تنقید کے ان معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔''[8] بعد میں کتابوں میں تقریظ نگاری کا رواج پڑا۔ یہ تقریظیں نثر اور نظم دونوں صورتوں میں لکھی گئیں۔ ان میں کتاب کی تعریف کی جاتی اور اسے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ ان تقاریظ کی تنقیدی اہمیت قدرے کم ہی ہوتی تھی کیوں کہ ان میں کتاب کے محاسن پر زور ہوتا تھا۔ معائب کے بیان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم کتابوں پر ان تقاریظ کا فائدہ یہ ہوا کہ قاری کتاب پڑھنے سے پہلے کتاب کے بارے میں کچھ آگاہی حاصل کر لیتا تھا۔[9] جیسے جیسے تحقیق و تنقید کے فن نے ترقی پائی، ویسے ویسے کتابوں میں شامل کی جانے والی ان تحریروں میں بھی تبدیلی آئی اور کتاب کے حسن کے ساتھ اس کے عیب بھی بیان ہونے لگے۔ اس طرح یہ فن تقریظ نگاری سے آگے بڑھا اور اسے پیش لفظ، دیباچہ نویسی اور مقدمہ نگاری کا نام دیا گیا۔

ڈاکٹر قدرت اللہ نقوی نے ایک مضمون بہ عنوان ''دیباچہ (ایک صنف سخن)'' میں تمہید، مقدمے اور دیباچے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ تمہید کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ: ''تمہید مضمون کے لیے مضمون نگار لکھتا ہے۔ شاعر قصیدے وغیرہ میں تمہید لکھتے ہیں۔ قصیدے کی تمہید کو تشبیب کہتے ہیں۔''[10] جب کہ مقدمے کے بارے میں لکھا ہے: ''مقدمہ کتاب کے لیے لکھا جاتا ہے جس میں موضوع سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ ضمناً دیگر کوائف بھی بیان کر دیے جاتے ہیں۔ بیان کا انداز استدلالی ہوتا ہے۔''[11] دیباچے

کی بابت لکھتے ہیں: ''دیباچہ، رسائل یا کتابوں پر لکھا جاتا ہے۔ اس میں کوائف ومحرکات وغیرہ پر زور دیا جاتا ہے۔ موضوع کی صراحت یا تاریخ یا ارتقاء پر بھی ضمناً روشنی ڈالی جاتی ہے یا اس کا کسی اچھے انداز میں تعارف کرایا جاتا ہے لیکن یہ ساری باتیں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ اس کا انداز بیانیہ ہوتا ہے۔''[۱۲] دیباچہ نگاری کو تنقید کی ایک ایسی شاخ بھی کہا گیا ہے جس میں دیباچہ نگار کو شاعر یا ادیب کی شخصیت کے حوالے سے اس کے فن کی باریکیوں اور نزاکتوں کا سراغ لگانا ضروری ہوتا ہے۔''[۱۳]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیباچہ صرف مصنف یا اس کی تصنیف کا وسیلۂ تعارف ہوتا ہے اور اس کا اندازِ تحریر استدلالیہ کی بجائے بیانیہ ہوتا ہے، جب کہ مقدمات تحقیقی اور تنقیدی مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تاریخی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر بحث کی جاتی ہے اور ان میں تنقید کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔''[۱۴]

دیباچے، مقدمے اور تبصرے کی بابت آل احمد سرور کا تجزیہ ہے:

> ''عموماً تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں جو تنقید ملتی ہے اس میں تنقید کے علیحدہ علیحدہ رنگ پائے جاتے ہیں کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کا میدان الگ ہے۔ دیباچے میں کتاب یا صاحبِ کتاب کا تعارف ہوتا ہے، اس کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس میں اس کتاب کی قدر و قیمت متعین نہیں کی جاتی، بل کہ اس سے قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جب کہ مقدمہ اس سے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ کتاب کی قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قولِ فیصل بھی پیش کرتا ہے۔ تبصرہ یا ریویو بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر عام طور پر مقدموں میں بالغ نظری سے زیادہ شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر یقیناً گمراہ کن ہوتے ہیں۔''[۱۵]

ڈاکٹر نجیب جمال لکھتے ہیں:

> ''دیباچہ نگاری کی سرحدیں بہت زیادہ پھیلی ہوئی نہیں ہیں۔ دیباچہ نگار کو مصنف اور کتاب کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطالب بیان کرنے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کتاب کے متن اور اس کی پیشکش کے بارے میں ایک رائے قائم کرنی ہوتی ہے اور یہ خیال بھی رکھنا ہوتا ہے کہ لازماً رائے ایسی ہونی چاہیے کہ دیباچہ نگار کی باتیں کتاب اٹھانے والے کے اشتیاق میں اضافہ کر دیں اور یہی نہیں بلکہ جب وہ کتاب پڑھ لے تو اسے دیباچہ نگار کی رائے سے اتفاق کرتے ہی بنے۔''[۱۶]

یہ کہنا درست ہے کہ کسی کتاب کے ابتدائی تعارف کو دیباچہ کہتے ہیں، جس میں ایسے ضروری امور کو بیان کیا گیا ہو جنھیں متن میں بیان نہ کیا گیا ہو، لیکن وہ متن سے متعلق ہوں۔[۱۷] دیباچے میں کتاب اور صاحبِ کتاب کا تعارف یا صرف کتاب کا تعارف اور کتاب کے موضوع و مشمولات کا تجزیاتی مطالعہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب پر ایک طرح کی ماہرانہ رائے ہوتی ہے۔ دیباچہ نگاری کی بنیادی شرط دیباچہ نگار کا موضوع سے متعلق جامع مطالعے کا حامل ہونا ہے۔ چوں کہ مصنف نے سوچ سمجھ کر موضوع کے انتخاب کے بعد مواد کی جانچ پرکھ کر کے کتاب ترتیب دی ہوتی ہے اور اپنا وقت اور دوسرے وسائل استعمال کیے ہوتے ہیں، اس لیے اس کتاب پر وہی شخص کم سے کم وقت میں تجزیہ لکھ سکتا ہے جس کا اس موضوع پر علم صاحبِ کتاب سے بڑھ کر یا کم از کم اس کے برابر ہو۔

اُردو نثر نگاری کے ابتدائی نمونے صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی تحریروں کی صورت میں سامنے آئے جنھوں نے تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے اُردو نثر کا سہارا لیا اور اس طرح اُردو ایک شعری زبان سے نثری زبان کی راہ پر گامزن ہوئی۔ نثر میں قلمی رسائل سے قلمی کتابوں کا سفر جاری رہا۔ کتابوں کے قلمی شکل میں سامنے آنے کے بعد رفتہ رفتہ نثر دیباچہ نگاری کی طرف بڑھی۔ سیّد عبدالولی عزلت سورتی نے اپنے مجموعۂ کلام کا دیباچہ اُردو میں تحریر کیا۔ ڈیڑھ صفحے پر مشتمل دیباچہ عربی فارسی آمیز مشکل الفاظ اور تراکیب میں لکھا گیا لیکن یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ عبدالرزاق قریشی رقم طراز ہیں:

> ''دیوانِ عزلت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دیباچہ اردو میں ہے ورنہ یہ رسم تھی کہ شعرا اپنے اردو دیوان کا بھی دیباچہ فارسی میں لکھا کرتے تھے۔ اگر چہ دیباچہ کی عبارت سے عزلت کے کسی ادبی نقطۂ نگاہ یا کسی اور اہم بات کا علم نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کسی اردو دیوان کا پہلا اردو دیباچہ ہے۔''۱۸

مرزا رفیع سودا دہلوی (متوفی ۱۷۸۱ء) نے اپنے کلام کا دیباچہ اُردو میں تحریر کیا ''یہ دیباچہ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں لکھا گیا۔''۱۹ اس دیباچے کی عبارت میں بھی اس زمانے کے چلن کے مطابق عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کثرت سے موجود تھے۔ ''میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے ''نو طرز مرصع'' ۱۷۷۵ء میں تالیف کی۔''۲۰ شاہ عالم ثانی کی نثری داستان ''عجائب القصص''، جو انھوں نے ۱۷۹۳ء میں لکھنی شروع کی، اس کا دیباچہ بھی اُردو میں لکھا گیا۔''۲۱ ''مذہبی کتابوں میں اُردو دیباچے کی روایت کا آغاز حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے قرآن پاک کے اُردو ترجمے سے ہوتا ہے جس کا سنہ ۱۷۹۰ء درج کیا جاتا ہے۔''۲۲

اُردو میں دیباچہ نگاری کی روایت فورٹ ولیم کالج کے ذریعے مزید آگے بڑھی۔ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی بیش تر کتابوں کے دیباچے لکھے گئے۔ ''محمد حسین آزاد نے بھی بعض مصنفین کی کتابوں پر مقدمے لکھے، جن سے مقدمہ نگاری میں ان کے تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔''۲۳ سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقائے کار نے اُردو نثر کو جدت کی راہ پر گامزن کیا۔ چناں چہ اس دور میں لکھی گئی کتابوں میں دیباچے کی روایت مزید مستحکم ہوئی۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے دیباچہ نگاری میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے مقدمات نے اسے آگے بڑھایا۔ اب تمام کتابوں کے آغاز میں مختلف عنوانات کے تحت دیباچہ شامل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان مقدمہ نگاری اور دیباچہ نگاری کے حوالے سے کس طرح سوچتے ہیں، اس کا اندازہ مقدمہ نگاری کے موضوع پر ان کے خیالات کے اظہار سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ مقدمہ نگار کی اپنی ذاتی کتابوں پر لکھے جانے والے مقدموں کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ''مقدمۂ ابن خلدون'' اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' ایسے دو مقدمے ہیں، جو مستقل تصانیف کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ان کی اہمیت اصل تصانیف سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ وہ ان مقدمات کا صاحبِ تصنیف سے تعلق کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں

ذاتی تصانیف پر مقدمہ لکھتے ہوئے مقدمہ نگار کے ذہن میں ہر بات پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ موضوع کی اہمیت و وسعت، اس کے نکات و رموز اور تصنیف و ترتیب کے دوسرے مسائل و مباحث اور کتاب کا ہر پہلو اس کے سامنے ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے مقدمے کی تنقیحات کر کے علم و فکر کی میزان پر تولنے کے بعد جرح و بحث کا سلسلہ قائم کرتا ہے اور اس طرح اپنی تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اصول و ضوابط کے بیان کی ایک مفید دستاویز بنا دیتا ہے۔'' ۲۴ وہ دوسروں کی تصانیفات و تالیفات پر مقدمہ لکھنے کے عمل کو ایک مشکل کام قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے:

> ''کسی شخص کو اپنی تصنیف کے بجائے کسی دوسرے کی تصنیف پر کوئی مقدمہ لکھنا ہو تو یہ کام اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ خصوصاً ہمارے معاشرے میں جہاں ''خطائے بزرگان گرفتن خطا است'' کو اخلاق کا معیار سمجھا جاتا ہے اور دروغ مصلحت آمیز کو راست گوئی پر ترجیح دی جاتی ہے وہاں دیانت کے ساتھ مقدمہ نگاری خاصی مُشکل ہو جاتی ہے۔ اردو میں ان مقدمات کا نام آپ تعارف رکھ لیں، پیش لفظ اور تقریظ کا نام دیں۔ اپنی نہج اور غرض و غایت کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان پر آمد سے زیادہ آورد کا غلبہ ہوتا ہے اور عام طور پر مقدمہ کہہ اٹھتا ہے کہ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔'' ۲۵

(۳)

ڈاکٹر فرمان مقدمہ نگاری اور دیباچہ نگاری کی روایت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ مقدموں اور دیباچوں کی حیثیت نثری قصیدہ گوئی کی رہی ہے، کیوں کہ اس سے برعکس صورت میں مقدمے یا دیباچے کو اپنی کتاب میں شامل ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ انھوں نے غالب کی سرسیّد کی تصنیف پر لکھی جانے والی منظوم تقریظ کا بھی حوالہ دیا ہے جو غالب نے سرسیّد کی فرمائش پر تحریر کی تھی لیکن اس میں تعریف کے ساتھ تقریظ نگار کی ذاتی رائے کے داخل ہونے کی وجہ سے سرسیّد کو یہ تقریظ ناگوار گزری اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں شامل ہی نہیں کیا۔ ڈاکٹر فرمان کہتے ہیں: ''اُردو کی تاریخ میں مدح سرائی کے علاوہ مقدمہ نگاری کا کوئی اور معیار پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا جس کی وجہ سے محتاط اور دیانت دار لکھنے والے اوّل تو کچھ لکھنے ہی سے دور بھاگتے تھے اور اگر کچھ لکھنا ہی پڑ جاتا تو اصل موضوع پر بات کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں میں چند صفحے کالے کر دیا کرتے تھے۔'' ۲۶

ڈاکٹر فرمان نے مولوی عبدالحق سے پہلے اُردو مقدمہ نگاری کی روایت کو بے جان، رسمی اور پست قرار دیتے ہوئے مولوی عبدالحق کو پہلا شخص کہا ہے۔ جنھوں نے اُردو مقدمہ نگاری کو بلند معیار، دل کش اسلوب اور آبرومندانہ مقام پر فائز کیا، اس کے تن مردہ میں نئی جان ڈالی اور اس کو رسمی حیثیت سے نکال کر مستقل فن کی حیثیت عطا کی۔ ۲۷ ڈاکٹر فرمان مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری کے طریقے کو مقدمہ نگاری کا معیار قرار دیتے ہوئے ان کے مقدموں کا تین منازل میں محاکمہ کرتے ہیں، جس سے ڈاکٹر فرمان کی دیباچہ شناسی کھل کر سامنے آتی ہے اور ان کے لکھے ہوئے دیباچوں کا مطالعہ اسی تناظر میں کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا ایک خاص ڈھب ہے۔ یہی ڈھب اب اردو میں مقدمہ نگاری کہلاتا

ہے۔مولوی صاحب کے ادبی مقدمات عام طور پر تین خاص منزلوں سے گزرتے ہیں۔سب سے پہلے وہ کتاب کے مصنف کا بھرپور تعارف کراتے ہیں،اس کی علمی قابلیت، سیرت، تعلیم وتربیت، اندازِ فکر، تصنیفی شغف اور تحقیقی وتنقیدی صلاحیت سب کا جائزہ لیتے ہیں۔اس کے بعد وہ ہمیں کتاب کے موضوع سے روشناس کراتے ہیں۔یہ روشناسی اتنی مفصل اور جامع ہوتی ہے کہ قاری اگر کتاب کے اصل موضوع سے چنداں واقف نہ ہو تو بھی مقدمے کے مطالعے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ کتاب سے استفادہ کر سکے۔اس کے بعد مولوی صاحب اصل کتاب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔یہ،مقدمے کی تیسری اور آخری منزل ہوتی ہے۔اس میں وہ کتاب کے سارے پہلوؤں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں اور اردو زبان میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔یہ سارا کام مولوی صاحب عجیب سادگی و پرکاری اور مدلل دل نشینی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔''[۴۸]

(۴)

ڈاکٹر فرمان نے اُردو زبان و ادب سے متعلق مختلف النوع موضوعات پر اپنی اور دوسرے مصنفین و شعراء کی کتابوں پر دیباچے لکھ کر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے جس طرح اُردو نظم و نثر سے متعلق متعدد اصنافِ سخن پر قلم اٹھایا، اسی طرح نظم و نثر کی مختلف اصناف سے متعلق لکھی گئی کتابوں اور شعری مجموعوں پر دیباچے تحریر کیے۔جن کتابوں پر انھوں نے دیباچے تحریر کیے ان میں ناول، افسانوں کے مجموعے، تحقیقی مقالے، تنقیدی و تحقیقی مضامین و مقالات کے مجموعے، سفرنامے، سوانح، تذکرے اور شعری مجموعے شامل ہیں۔دوسرے مصنفین کی کتابوں کے دیباچے تقریظ، پیش لفظ، ابتدائیہ، ملاحظات، دیباچہ اور مقدمہ کے عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔کچھ دیباچے کتاب سے متعلق خاص عنوان دے کر بھی لکھے گئے ہیں۔انھوں نے اپنی کتابوں کے زیادہ تر دیباچے ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے لکھے ہیں۔ان کے دوسرے مصنفین کی کتابوں اور اپنی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں میں بعض مختصر ہیں اور بعض طویل۔ مختصر دیباچوں میں ایسے دیباچے بھی ہیں جو ایک صفحے پر مشتمل ہیں اور طویل دیباچوں میں سولہ سترہ صفحات کے دیباچے بھی ملتے ہیں۔

ڈاکٹر نجیب الدین جمال نے ''کتاب سے پہلے'' اور ''کتاب کے بعد'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کے دیباچوں پر مشتمل دو کتابیں مرتب کر کے شائع کروائیں۔یہ دونوں کتابیں اظہار سنز، لاہور نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیں۔ان میں سے ''کتاب سے پہلے'' ڈاکٹر فرمان کے ان دیباچوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنی کتابوں پر لکھے۔اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان کی تیس اُردو کتابوں، اُردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء، تحقیق و تنقید، تدریسِ اُردو، غالب شاعر امروز و فردا، اُردو کی منظوم داستانیں، نواب مرزا شوق کی مثنویاں، دریائے عشق اور بحر الحبت کا تقابلی مطالعہ، اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، زبان اور اُردو زبان، اُردو کی نعتیہ شاعری، نیا اور پرانا ادب، قمر زمانی بیگم، ارمغانِ گوکل پرشاد، میر انیس، حیات اور شاعری، ہندی اُردو تنازع، اُردو املا اور رسم الخط، اقبال سب کے لیے، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، دید و بازدید، فنِ تاریخ گوئی اور اس کی روایت، تاویل و تعبیر، نیاز فتح پوری، شخصیت اور فن، اُردو کی ظریفانہ شاعری، اُردو کا افسانوی ادب، نیاز فتح پوری، دیدہ و شنیدہ، اُردو املا اور قواعد، اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، اُردو کی بہترین مثنویاں

،ادبیات وشخصیات،تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظم اور دو انگریزی کتابوں Sir Syed Ahmed Khan On The Present State of Indian Politics اور Pakistan Movement & Hindi Conflict کے دیباچے یک جا کیے گئے ہیں۔اوران پر اپنی ماہرانہ رائے بھی دی ہے۔

ڈاکٹر نجیب الدین جمال کی مرتبہ کتاب ''کتاب کے بعد'' ان دیباچوں پر مشتمل ہے، جو ڈاکٹر فرمان نے دوسرے مصنفین کی کتابوں پر لکھے۔اس میں چودہ دیباچے شامل ہیں،جن کا ڈاکٹر نجیب جمال نے تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ان دیباچوں میں نساخ، حیات وتصانیف (ڈاکٹر محمد صدر الحق)، واسوخت کا موجد اور اردو میں اس کی روایت (شمیم متھراوی)، تحقیق وتنقید۔منظر نامہ (ڈاکٹر طاہر تونسوی)، راجستھانی زبان وادب (باغ علی شوق)، بازگشت (امین نون)، پل صراط (ماہتاب محبوب)، سخنوران کاکوری (حکیم نثار احمد علوی)، شعور، سائنسی شعور اور ہم (ڈاکٹر عرش صدیقی)، تقابلی جائزے (عبدالعلیم صدیقی)، عجائب فرنگ (ڈاکٹر مظفر عباس)، سورج سمندر منظر بہ منظر (مرزا سلیم)، علی محمد پیرانی، گجراتی زبان کے ایک ممتاز ڈرامہ نگار (علی محمد پیرانی)، شاعر لکھنوی، لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر (شاعر لکھنوی) اور سید محمد جعفری اور ظریفانہ شاعری (سیّد محمد جعفری) شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان کے دوسرے ادباء وشعراء کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں پر مشتمل دو جلدیں ''تنقید نما'' کے عنوان سے سیّد محمد اصغر کاظمی نے مرتب کر کے شائع کروائیں۔پہلی جلد فرید پبلشرز، کراچی کے زیر اہتمام ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔اس میں ۴۶ کتابوں کے دیباچوں کو جمع کیا گیا ہے۔نثری کتب میں سترہ کتابوں سخنوران کاکوروی (حکیم نثار احمد علوی)، تقابلی جائزے (عبدالعلیم صدیقی)، نساخ عبدالغفور (ڈاکٹر محمد صدر الحق)، عجائباتِ فرنگ (ڈاکٹر مظفر عباس)، پُل صراط (ماہتاب محبوب)، تاریخ شاہ پور (سیّد محمد سالم محموری)، سورج سمندر (مرزا سلیم بیگ)، بازگشت (امین نون)، شعور، سائنسی شعور اور ہم (ڈاکٹر عرش صدیقی)، راجستھانی زبان وادب (باغ علی شوق)، حالات حسرت موہانی (مولانا عارف حسوی)، واسوخت (شمیم صہبائی متھراوی) یعنور میں چراغ (شاہدہ احمد)، تحقیق وتنقید (ڈاکٹر طاہر تونسوی)، سخنور (حصہ دوم) (سلطانہ مہر)، نیاز فتح پوری (ڈاکٹر ظہور احمد اعوان) اور سیاحت ماضی (احمد حسین صدیقی) اور شعری کتب میں انتیس کتابوں شہر آرزو (نصیر آرزو)، زخمِ بہاراں (مجید کھام گانوی)، زخمِ ہنر (شاعر لکھنوی)، اعتبار (اشفاق حسین)، مرقع شہاب (شہاب الدین رحمت اللہ)، اجالوں کے دریچے (سہیل غازی پوری)، لطیف آبگینہ (وحید متین)، نوائے بے نوا (مسرت علی مسرور)، شوخیِ تحریر (سیّد محمد جعفری)، کشیدِ فکر (انور دہلوی)، اردو نعت، تاریخ وارتقا (سیّد افضال حسین نقوی)، کشکولِ وفا (سیّد مہدی حسن حسرت)، اقدار (قاسم جلالی)، جرسِ گل (گلنار آفرین)، لذتِ آزار (نصیر کوٹی)، افکارِ برق (برق اجمیری)، آشوبِ روزگار (ساقی جاوید)، ذکرِ ارفع (مبارک مونگیری)، حرفِ معتبر (ستار وارثی)، لعلِ بدخشاں (تسنیم فاطمہ)، یہ بات چلی مجھ سے (منظر علی خان)، صنم کدہ ہے جہاں (ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد)، جو دل پہ گزری ہے (عقیل احمد فضا اعظمی)، نوشتۂ دیوار (سیّد اشتیاق اظہر)، طلسمِ حرف (م۔اخلاق)، اُڑتی گرد بہار بنی (مشہود حسن رضوی)، مضراب (محمد مرسلین شیدا)، صلیبِ عصر (اصغر یگانہ) اور بدرِ کامل (بدرالہٰ آبادی) کے دیباچے شامل ہیں۔

''تنقید نما'' کی دوسری جلد حرا فاؤنڈیشن کراچی نے شائع کی۔اس میں ۵۳ دیباچے شامل ہیں،جن میں پندرہ نثری کتب رشتے۔تین ڈرامے (علی محمد پیرانی)،اردو نثر اور معروف نثر نگار (پروفیسر ایوب علی)،ایک گاؤں کی کہانی (رضوان صدیقی)،بیسویں صدی میں اُردو غزل (علاّمہ نیاز فتح پوری)، غالب ،فن و شخصیت (علاّمہ نیاز فتح پوری)، فرمائش (رشید صدیقی)، سیرت نگاری (عبدالعزیز عرفی)، جہانِ شمس (سیّد اسماعیل ذبیح ترمذی)،مظفر ضیا،شخصیت اور فن (بیگم نفیس مظفر ضیا)، دلّی سے ڈیفنس (سبوحہ خان)، الاؤ کے پھول (فرید نسیم علوی)، اظہارِ خیال (دوست محمد فیضی)، وزیر باتقریر (حامد سعید اختر)،حواس باختہ (ڈاکٹر ایس۔ایم معین قریشی)، حسرت موہانی کی حمد و نعت (سیّد محمد اصغر کاظمی)، اوراڑتیس شعری کتب مُسدّ فخرِ کونینؐ (محشر رُسول نگری)،نقش ہائے رنگ رنگ (عبدالملک خان)،رُباعیاتِ صادق (صادق دہلوی)،بُوٹم (سیّد انور علی انور)،رَت جگے (ثمر نظامی)،گُزرگاہِ خیال (شکیل نشتر)، انبساط کرب (سیّد محمد نجم الدین)،صلیبِ انقلاب (پروفیسر منظور حسین شور)،رمزِ حُسن (شاہد نجیب آبادی)،عبادت (ڈاکٹر یاور عباس)، شاخسار (غنی دہلوی)،مُسدسِ نسیم (نسیم امروہوی)،غزلیات (ارشد بدایونی)،صدخلش (ڈاکٹر صدیقہ ارمان)، جوئبار (غنی دہلوی)، اذانِ سحر (غنی دہلوی)،خورشید (سیّد انور علی انور)،مہک گُلِ داؤدی (مرتبہ جاپان ثقافتی مرکز)،نظمانے (محسن بھوپالی)، سوچ کا سفر (ثروت سلطانہ)،نسیم حجاز (غنی دہلوی)،زادِ آخرت (جامی بدایونی)،جرأتِ رندانہ (رند بدایونی)،عکسِ سحر (اشرف فتح پوری)، گلاب موسم عذاب موسم (شایاں علی)، چاند میری زمیں (ساقی جاوید)،اوٹ سے (مقصود الیس۔اے حسنی)،اب دریچوں کو نہ بند رکھنا کبھی (جمیل صبا)،دشتِ جنوں (عمر فیضی)،نغمۂ عندلیب (سیّد محمد یوسف علی)،نقشِ اوّلین (زاہد فتح پوری)، طائرِ معرفت (راقم علیگ)، بشارتوں کا امین موسم (خورشید بیگ میلسوی)، یادوں کے اجالے (شباہت علی خان)، تلخ و شیریں (سیّد منیف اشعر) لوحِ محفوظ سے (سجاد احمد ساجد مرادآبادی)،حضوری چاہتی ہوں (پروین جاوید)،خلقِ مجسّم (سیّد محمد حنیف اخگر) شامل ہیں۔

اُردو ادب میں مقدموں ،دیباچوں اور تبصروں کو یک جا مرتب کر کے شائع کروانے کی روایت بہت کمزور ہے،مگر ان حالات میں ڈاکٹر نجیب الدین جمال اور سیّد محمد اصغر کاظمی نے ڈاکٹر فرمان کے لکھے گئے دیباچوں کے مجموعوں کو شائع کروا کر اس روایت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ڈاکٹر فرمان جیسے نقاد اور محقق کی دیباچوں کی شکل میں ادبی تنقیدی و تحقیقی آراء یک جا حالت میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ڈاکٹر فرمان کے تمام دیباچوں کا تجزیہ طوالت کے پیشِ نظر ممکن نہیں،لیکن ان کے دوسرے مصنفین اور اپنی کتابوں پر لکھے گئے بعض دیباچوں کے تجزیاتی مطالعے سے ان کے فن و فکر کو جانچا جا سکتا ہے۔چنانچہ پہلے ڈاکٹر فرمان کے کچھ مصنفین کی تصانیف پر لکھے گئے دیباچوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اُس کے بعد میں ان کے اپنی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

(۵)

ڈاکٹر فرمان کا پہلا دستیاب دیباچہ حکیم نثار احمد علوی کی تصنیف ''سخنوارانِ کاکوری'' پر ہے،جو ''پیش لفظ'' کے عنوان اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لکھا گیا۔یہ دیباچہ پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔دیباچے میں اتر پردیش کے قصبے کاکوری کا تعارف اس قصبے کی علم دوستی،

دانش جوئی، سخن وری اور دینی و دنیوی خدمات کے حوالے سے کراتے ہوئے اس علاقے سے تعلق رکھنے والے ان اہل علم وادب کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے اُردو زبان وادب پر کسی بھی لحاظ سے اثرات چھوڑے۔ نعت گوئی میں محسن کاکوروی، شاعری کے حوالے سے نادر کاکوروی، درد کاکوروی، اور ناظر کاکوروی کا اجمالی تعارف کرانے کے ساتھ سعدی کاکوروی کو ایوانِ شعروادب کی بنیاد رکھنے والوں میں سرِ فہرست قرار دیا گیا ہے۔ نثر نگاری میں جعفر علی شیون کی ''طلسم حیرت'' کو اُردو کے داستانوی ادب میں میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کے ادبی معرکوں کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے۔ ظرافت وصحافت میں منشی سجاد حسین اور ظفر الملک کی خدمات، لغت نگاری میں نور الحسن کاکوروی کی ''نور اللغات''، تنقید اور سوانح نگاری میں امیر احمد علوی اور ان کی تصنیف ''یادگارِ انیس'' اور حکیم نثار احمد علوی کی تصنیف ''سخنورانِ کاکوروی'' کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اس تذکرے کی افادیت اور جامعیت پر روشنی ڈالی ہے۔

سعدی شیرازی اور سعدی کاکوروی کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ ریختہ کے مشہور شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اُردو شاعری کے تاریخی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں سخن سرائی یا ریختہ گوئی کا رواج بھی اہل کاکوری کے ہاتھوں ہوا ہے۔ ریختہ کا یہ مشہور شعر
>
> سعدی بگفتہ ریختہ، دُر ریختہ، دَر ریختہ
> شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے، ہم گیت ہے
>
> جسے اُردو کے قدیم ترین نمونۂ کلام میں شمار کیا جاتا ہے۔ سعدی کاکوروی کا ہے۔ بعض حضرات نے سعدی کاکوروی کو سعدی شیرازی خیال کر کے بہت سی بے سروپا باتیں ان سے منسوب کر دی ہیں۔ شیخ سعدی نہ کبھی ایران سے اس طرف آئے، نہ اُردو میں شعر کہے اور نہ مذکورہ بالا شعر سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ یہ شعر حقیقت میں عہدِ اکبری کے ایک صوفی منش بزرگ سعدی کاکوروی کا ہے اور اُردو شاعری کے ابتدائی نقوش کا پتہ دیتا ہے۔''۲۹

ایک اور دیباچہ علامہ نیاز کی کتاب ''غالب فن وشخصیت'' (۱۹۸۷ء) پر ہے، جو کتاب میں ''ملاحظات'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کتاب میں علاّمہ نیاز کے غالب کے موضوع پر لکھے گئے وہ مضامین شامل ہیں، جو ''نگار'' کراچی میں شائع ہوئے۔ دیباچے میں علاّمہ نیاز کی غالب شناسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاّمہ نیاز کی ''نگار'' خصوصی سالناموں کے ذریعے اُردو کے شعراء کی خدمات کو سامنے لانے کی کاوشوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مومن نمبر (۱۹۲۸ء)، بہادر شاہ ظفر نمبر (۱۹۳۰ء)، مصحفی نمبر (۱۹۳۹ء)، نظیر اکبر آبادی نمبر (۱۹۴۰ء)، ریاض خیر آبادی نمبر (۱۹۴۳ء)، داغ نمبر (۱۹۵۳ء) اور غالب نمبر (۱۹۶۱ء) کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ علاّمہ نیاز کے متعلق پائی جانے والی اس بدگمانی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ غالب سمیت تمام شعرا کو مومن کے مقابلے میں کم تر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''علاّمہ نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۸ء میں نگار کا مومن نمبر شائع کیا تو اپنے مقالے کا آغاز اس طور پر کیا۔ 'اگر

میرے سامنے اردو کے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو بلا تامّل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دے دو اور باقی سب اُٹھا لے جاؤ۔' مومن کے سلسلے میں یہ رائے کچھ اس نوع کی تھی کہ ادبی حلقوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی اور عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ علاّمہ کے نزدیک دوسرے تمام شعراء بشمول غالب، مومن کے مقابلے میں کمتر درجے کے ہیں۔ لیکن واقعتاً ایسا نہ تھا بلکہ جیسا کہ بعد کی تحریریں شاہد ہیں ان کا مقصودِ اصلی یہ تھا کہ مومن جیسے غزل گو کی طرف اہلِ نظر کی توجہ مبذول کرائی جائے اور اس بے اعتنائی و کم نگاہی کا ازالہ کیا جائے جو مومن کے ساتھ ایک عرصے سے برتی جارہی ہے۔''[۳۰]

اُردو ناول ''امراؤ جان ادا'' پر جہاں تنقیدی و تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے گئے، وہیں اس کے مختلف ایڈیشنوں پر نام ور ادبا کے مقدمے بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر فرمان نے بھی اس کا مقدمہ لکھا۔ ان کے مقدمے کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس ناول اور اس کے مختلف ایڈیشنوں میں شائع ہونے والے مقدمات کا مطالعہ کرنے کے بعد نہایت سوچ سمجھ کر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی عالمانہ رائے میں وزن پایا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے اس ناول کے طویل مقدمے میں ناول کے تاریخی، سماجی، معاشی اور معاشرتی پس منظر کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور جو بھی لکھا دلائل، شواہد اور مستند حوالوں کے ساتھ لکھا ہے۔

گجراتی زبان کے ڈراما نگار علی محمد پیرانی کے گجراتی ڈراموں کے اُردو ترجمے ''رشتے۔ تین ڈرامے'' کے دیباچے میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعارف، اُردو اور گجراتی زبان کے قدیم باہمی تعلق اور ان دونوں زبانوں کے ایک دوسرے پر خیالات و الفاظ کے اثرات کے حوالے سے بحث کے علاوہ فنِ ڈرامہ نگاری اور علی محمد پیرانی کے ڈراموں کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کا یہ مطالعہ کتاب اور اس کے مصنف کے تعارف تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اُردو، گجراتی اور ان کے باہم تعلق نیز فنِ ڈرامہ نگاری پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

پروفیسر ایوب علی کی ''اُردو نثر اور معروف نثر نگار'' کے دیباچے میں شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری کی مشکلات، نثر نگاری کے تقاضوں، اہلِ قلم کی سہل نگاری اور ان کے محدود مطالعے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ دورِ حاضر میں نئی معلومات اور تازہ ترین حقائق کو مدِ نظر رکھ کر لکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ دیباچہ عالمانہ نوعیت کا ہے، جس میں اُردو نثر نگاری اور اس کے تقاضوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

سیّد محمد جعفری کے مجموعۂ کلام ''شوخیِ تحریر'' (۱۹۸۵ء) کے دیباچے میں شاعر کے تعارف کی سطور کو الگ کر کے دیکھا جائے تو یہ ایک مختصر سوانحی خاکے سے کم نہیں اور اگر ان کے ساتھ شاعرانہ خصوصیات کے حوالے سے لکھی ہوئی سطور کو شامل کر کے پڑھا جائے تو یہ شاعر کی حیات و خدمات پر ایک تنقیدی و تحقیقی مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دیباچے میں شاعر کے تعارف، اس کی شاعرانہ خصوصیات کے بعد اُردو کی ظریفانہ شاعری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں جعفر زٹلی، سودا، انشاء، غالب، نظیر اکبر آبادی اور

اکبرالہٰ آبادی کی ہجونگاری اور ظرافت کا مطالعہ ان کے عہد کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی تناظر میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ طنز و مزاح میں سیّد محمد جعفری کی دل چسپی، تخیل، قادرالکلامی، فنکارانہ مرتبے، اسلوب طرز اور موضوعات کی ہمہ گیریت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ مجموعۂ کلام ''شوخیِ تحریر'' میں شاعرانہ، طنزیہ و ظریفانہ اسلوب میں معاشرتی سماجی تقسیم، ناانصافی، بے اعتدالیوں اور عدم مساوات اور ان کے اخلاقی و روحانی اثرات کا مطالعہ جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''نظموں سے صرف یہی نہیں کہ سیّد محمد جعفری کی ظریفانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اُن کے سوچنے کا انداز اور سماجی زندگی کے بارے میں ان کے ذہنی رویوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ دونوں نظموں میں فی الواقع اس ریاکاری اور دورنگی کا پردہ چاک کیا ہے جو ہماری سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی کو اخلاقی و روحانی طور پر دیوالیہ بنائے دے رہی ہے۔''[۳۱]

ڈاکٹر محمد صدرالحق کے پی ایچ۔ڈی مقالے ''نساخ، حیات و تصانیف'' (۱۹۷۹ء) کے دیباچے میں عالمانہ بحث ملتی ہے۔ دیباچے کو مقالہ نگار اور مقالے کے تعارف تک محدود رکھنے کی بجائے موضوع کے حوالے سے پرمغز بحث کی گئی ہے۔ نساخ کے مختصر سوانح، معاصر شعرا و ادبا کے تناظر میں ان کی تصنیفات و تالیفات کے معیار و مقدار پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی تصنیف ''انتخاب نقص'' پر بحث کرتے ہوئے اسے نساخ کا دیانت دارانہ اور جرأت مندانہ اقدام قرار دیا ہے، جس کے تحت لسانی اور تنقیدی بحثوں کی تحریک نے اُردو میں جنم لیا۔ نساخ کی تذکرہ نگاری کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان کے تین تذکروں ''قطعہ منتخب''، ''تذکرۃ المعاصرین'' اور ''سخن شعراء'' کا اجمالی تعارف کروایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صدرالحق کے مقالے کی ابواب بندی اور ان ابواب میں زیرِ بحث لائے گئے امور کے اہم نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالے کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

عبدالعلیم صدیقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تقابلی جائزے'' (۱۹۷۹) کے دیباچے میں مصنف کے تعارف کے بعد دورِ حاضر کے ادبی تنقیدی تقاضوں، ناقدین کے سماجی شعور اور وسیع مطالعے کی ضرورت، مختلف زبانوں میں ان کی مہارت و دسترس، انگریزی زبان سے واقفیت اور ان کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، علّامہ نیاز فتح پوری، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، محمد حسن عسکری، سجاد باقر رضوی، مظفر علی سیّد، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی تنقیدی تحریروں کے پیچھے کارفرما تنقیدی شعور اور بصیرت پر بحث کرنے کے بعد عبدالعلیم صدیقی کے مجموعۂ مضامین ''تقابلی جائزے'' کے تقابلی مطالعات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر فرمان اس تقابلی جائزے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''علیم صدیقی کے ذہن کو شاعروں اور ادیبوں کے تقابلی مطالعوں سے خاص مناسبت اور دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے بیشتر مقالے اس نوعیت کے ہیں۔ ان مقالات میں انہوں نے ہر شاعر و ادیب کے مخصوص حالات و واقعات اور ان سے پیدا شدہ مسائل و نتائج کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ ہر زبان کی ادبی و شعری روایات، ان کے منظر و پس منظر اور ان کے اثرات و امکانات پر نظر ڈالی ہے۔ نتیجتاً وہ کہیں بھی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے

۔ چنانچہ نہ بے جا مرعوبیت ان کے یہاں نظر آتی اور نہ بے محل تفاخر ہی نے ان کی تحریروں میں جگہ پائی ہے۔ کسی کی وکالت ان کے زاویہ تنقید کا منصب نہیں۔ وہ بے لاگ مبصر کی حیثیت سے ادیب اور ادب پارے پر نظر ڈالتے ہیں اور حقائق و دلائل کے ساتھ اس کی قدر و قیمت واضح کر دیتے ہیں۔'' ۳۲

اُردو کے پہلے سفر نامے ''عجائبِ فرنگ'' کو ڈاکٹر مظفر عباس نے نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کروایا۔ اس کے دیباچے میں سفر، سفر نامے، ان کے مفہوم، اہمیت، افادیت، اُردو میں اس کے رواج اور یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے ''عجائبِ فرنگ'' کی تاریخ، اُردو کے سفر ناموں کی روایت میں اس سفر نامے کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالنے کے بعد اس سفر نامے کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر مظفر عباس کی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی رائے یہ ہے:

''یہ سفر نامہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور ۱۸۵۰ء سے کچھ پہلے اس زمانے میں لکھا گیا ہے جس کی معاصر یادگاریں، رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' اور سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید ہیں۔ ظاہر ہے اس زمانے کا اردو اِملا اور اس وقت کا اسلوب نگارش بہت صنا عانہ اور آج سے مختلف ہے۔ سفر نامہ کی ترتیب اور ابواب کی تقسیم، آجکل کے سفر ناموں جیسی نہیں ہے۔ ایسے میں لطف اندوزی کے ساتھ اس کا مطالعہ و افادہ عام قاری کے لیے خاصا مشکل تھا، ڈاکٹر مظفر عباس نے اس مشکل کو آسان کر دیا یعنی اصل متن مجروح کیے بغیر اس کے مندرجات کو نئی ترتیب و تزئین کیساتھ اس طرح سامنے لے آئے کہ اب اسے رواں دواں انداز میں لطف لے کر بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے میں انہوں نے رموزِ اوقاف سے بھی مدد لی ہے اور حسبِ ضرورت بعض الفاظ کے قدیم املا کو بھی آج کے مروجہ املا کے مطابق کر دیا ہے۔'' ۳۳

محبوب مہتاب کے افسانوں کے مجموعے ''پلِ صراط'' کے دیباچے میں ان کے افسانوں کا تجزیہ زندگی کے حقائق اور معاشرے کی اقدار و روایات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ ان معاشرتی اور سماجی عوامل کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، جو ان افسانوں کے محرک بنے۔ مہتاب کے نفسیاتی مطالعے، معاشرے میں خواتین کی حالتِ زار اور اس بارے میں افسانہ نگار کی بصیرت، شعور و آگہی اور اسلوبِ بیان کو بھی موضوعِ دیباچہ بنایا ہے۔ اس طرح اس افسانوں کے مجموعے کے مطالعے سے قبل ہی قاری افسانہ نگار کے ذہنی شعور و بالیدگی اور افسانوں میں زندگی کی عکاسی کے بارے میں آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مجموعے کے عنوان ''پل صراط'' کو افسانوں کے حوالے سے اپنے تجزیے میں لاتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: ''ماہتاب نے اپنے افسانوں کے ذریعے بلند و بال دیواروں میں تتلی کی طرح مقید، معصوم عورت کا چپ احتجاج ہم تک پہنچایا ہے۔ زندگی میں ایک عورت کو قدم قدم پر کیسے کیسے ''پل صراط'' پار کرنے پڑتے ہیں۔'' ۳۴

اُردو کے ڈراما نویس اور افسانہ نگار امین نون کی خودنوشت ''بازگشت'' (۱۹۹۱ء) کے دیباچے کے آغاز میں کتب بینی کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں خودنوشت نگاری، اس کے فنی و فکری تقاضوں، اُردو زبان میں اس کی روایت، اس کی مختصر تاریخ اور ان کے معیار اور اسلوبِ بیان کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان کی رائے میں اُردو زبان میں لکھی گئی تمام خودنوشت

سوانح عمریوں میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے اور زیادہ تر میں صیغہ واحد متکلم ''میں'' اور ''میرا'' کے تحت حالاتِ زندگی کا بیان ملتا ہے۔ جب کہ امین نون نے اپنی خودنوشت میں نیا رنگ بھر کے حالات و واقعات کے بیان میں اپنی ذات کے عمل دخل کو محدود رکھا ہے اور خالص افسانوی انداز میں اپنے حالات لکھے ہیں، جس کی بناء پر ان کا اسلوبِ خودنوشت اُردو زبان میں نیا اور اچھوتا ہے۔ دیباچے کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''امین نون کی کتاب اپنے اسلوب اور مواد، ہر اعتبار سے اُردو خودنوشت کی تاریخ میں گرانقدر اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ صرف یہی نہیں کہ ذہن و روح کے لیے لطف و نشاط کا سامان فراہم کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے مشاہدات و تجربات کے بعض ایسے رُخ بھی سامنے آتے ہیں جو آدمی کو انسان بنانے میں مدد کرتے ہیں۔''۳۵

صادق دہلوی کا شعری کلام ''رباعیات صادق'' رباعیات کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فرمان نے صنفِ رباعی پر روشنی ڈالتے ہوئے رباعی کی ہئیت، فن، زبان و بیان اور شاعر کے فن و فکر پر اظہار خیال کیا ہے۔ رشید صدیقی کی تخلیقی کتاب ''تحفہ'' (۱۹۸۹ء) کا دیباچہ بہ عنوان ''فرمائش'' تحریر کیا۔ اس میں کتاب اور مصنف کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر فرمان کی ایک خوبی ہے کہ وہ تنقید اس انداز میں کرتے ہیں کہ کمزور پہلو بھی سامنے آجائے اور حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی ہو۔ اس دیباچے میں ان کے اس انداز کو دیکھا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ان کے اسلوب فن کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان کے یہاں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لب و لہجے کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ رہ گئی پختگی کی بات سو، وہ آتے آتے آجائے گی۔ تحفہ کے مصنف کو خبر ہے کہ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔''۳۶

ثمر نظامی کے شعری مجموعے ''رت جگے'' (۱۹۷۹ء) کے دیباچے میں اس مجموعے کو عام طور پر چھپنے والے بیشتر شعری مجموعوں کے مقابلے میں رنگ و نور اور فکر و شعور کی نئی دنیا قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے خیال میں ثمر کے ہاں حسن و عشق کی روایتی شاعری کی بجائے زندگی، نفسیاتِ انسانی، رمز آشنائی، سماجی زندگی کا گہرا جمالیاتی شعور اور تہذیبی زندگی سے گہری وابستگی کا احساس ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ثمر نظامی ان شاعروں میں بھی نہیں کہ جو غمِ جاناں و غمِ روزگار کے خوبصورت تذکرے ہی کو شاعری جانتے ہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، وہ ان سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں، ان کی رجائی طبیعت، آشوبِ غم کے سامنے سپر انداختہ ہونے پر آمادہ نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی ترشی کو شیرینی میں، کثافت کو لطافت میں، تیرگی کو روشنی میں اور نفرت کو محبت میں بدل لینے کی ہمت رکھتی ہے۔''۳۷

شکیل نشتر کے کلام ''گزرگاہِ خیال'' (۱۹۸۳ء) کے دیباچے میں ان کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے بحر، وزن، قافیہ، ردیف اور زبان و بیان کے مروجہ اصولوں کی پابندی کے باعث روایتی اور کلاسیکی قرار دیتے ہیں، لیکن اندازِ فکر اور طرزِ احساس کے حساب سے ان غزلوں کو حال کی ترجمان قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر فرمان نے ماضی اور حال کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ شاعر کے

تاثرات اور فکر و احساس کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ سیّد محمد نجم الدین کے شعری مجموعے ''انبساطِ کرب'' (۱۹۸۳ء) کے دیباچے میں جہاں شاعر کی شاعرانہ خصوصیات پر قلم اٹھاتے ہیں، تو وہاں شاعری میں موجود سماجی و معاشرتی پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے محبت و غم کی کیفیات و احساسات کو ایسے رنگ قرار دیتے ہیں، جو ایک فرد کی ذات سے نکل کر شعر و ادب کے ہر قاری کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ رضوان صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک گاؤں کی کہانی'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچے میں مصنف کی افسانہ نگاری کو سراہتے ہوئے کہانی کے عام بیانیہ انداز، سادہ بیانی، حق گوئی، گرد و پیش کی زندگی کے تلخ حقائق، غموں اور خوشیوں، صنعتی تہذیب، جدید زندگی کے حوالے سے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ رضوان صدیقی کے افسانوں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''رضوان صدیقی کے افسانے اور اس کے کردار، کسی ماورائی اور تخیلاتی دنیا کی مخلوق نہیں ہیں، بلکہ ان کا صریح تعلق ، ہماری اور آپ کی روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ بالکل سامنے کی تہذیبی ہواؤں اور فضاؤں سے ہے جن میں ہم آپ جی رہے ہیں سانس لے رہے ہیں اور جنہیں ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔''۳۸

سیّد منیف اشعر کے مجموعہ کلام ''تلخ و شیریں'' کا دیباچہ ڈاکٹر فرمان نے ۲۰۰۲ء میں تحریر کیا۔ انھوں نے اس دیباچے میں اشعر کے مجموعۂ کلام میں شامل غزلوں اور نظموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اشعر کی شاعری کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، اس کے مطابق ان کی غزلیں اور نظمیں بہ اعتبار معیارِ فن اور لطفِ سخن ایک دوسرے کے متوازن اور متوازی ہیں اور پڑھنے والے کے لیے دل کشی اور آسودگیٔ ذہن کا سامان رکھنے کے ساتھ قدیم و جدید روایات کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فن کار کی شخصیت کو اس کے فن پاروں کی روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چناں چہ پروفیسر منظور حسین شور کے مجموعۂ کلام ''صلیبِ انقلاب'' (۱۹۸۵ء) کے دیباچے میں اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''شور صاحب کو جب ان کی شاعری کے حوالے سے دیکھیے اور ان کی شخصیت کو ان میں تلاش کیجیے تو محسوس ہوگا کہ نہ یہ خود بینی ہے نہ بے نیازی بلکہ جزئیاتی و انفرادی مشاہدے کی ایک ایسی انجذابی کیفیت ہے جو پروفیسر شور صاحب پر اکثر طاری رہتی ہے۔ یہ انجذابی کیفیت جو کبھی کبھی الہتابی صورت اختیار کر لیتی ہے شور صاحب کو ذرا دیر کے لیے بھی اپنے گرد و پیش سے لاتعلق نہیں ہونے دیتی بلکہ ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ، ذرّے میں صحرا، قطرے میں دجلہ اور جزو کو کل دیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ گویا سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری کی تعبیر قرار پاتا ہے۔ ذاتی مشاہدے اور تجربے کا یہی وہ بنیادی اور ناقابلِ شکست رشتہ ہے جو پروفیسر شور کو حقیقی معنی میں شاعرِ فطرت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔''۳۹

نسیم امروہوی کے کلام ''مسدسِ نسیم'' (۱۹۸۶ء) کے دیباچے میں شاعر کے علمی و ادبی تعارف کے بعد ان کی شاعرانہ خصوصیات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کے منفرد انداز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرثیوں میں روایات کے انتخاب و صحت، اسلام اور تاریخِ اسلام کی روح تک مکمل رسائی اور خاص طور آنحضور ﷺ کی رحلت کو موضوعِ سخن بنانے کے حوالے

سے نسیم کے کلام کا تعارف اور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔غنی دہلوی کے شعری مجموعے ''شاخسار'' (۱۹۸۶ء) کے دیباچے کے آغاز میں نظم گوئی اور غزل گوئی کے فن کے بارے میں ڈاکٹر فرمان کا تجزیہ ان کی سخن فہمی کا عمدہ ترجمان ہے۔لکھتے ہیں:

> ''غزل کی شاعری عجیب وغریب قسم کی شاعری ہے،نظم کی طرح یہ علم وفکر یا الفاظ کے تصنع وتجمل کے ذریعہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔اس کے لیے خاص قسم کے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔بارہا دیکھا گیا ہے ایک پڑھا لکھا آدمی موضوع اور مواد کے سہارے نظم کے مفہوم تک تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتا ہے لیکن غزل کے دو سادے سے مصرعے اس کے سر سے گزر جاتے ہیں۔وجہ صرف اتنی ہے کہ نظم کے برعکس،غزل میں جو بات کہی جاتی ہے وہ کم سے کم لفظوں میں کہی جاتی ہے صاف صاف بہتر رمز وایما کے ساتھ کہی جاتی ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ غزل کی لفظیات اور اس کے استعمالات کا ایک خاص نظام ہے۔اس نظام میں ہر لفظ معنی کے کئی کئی رنگ رکھتا ہے۔جب تک کسی کی نظر ان سارے رنگوں پر نہ ہو،وہ غزل کے اشعار سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔یہی وہ مشکلات ہیں جن کے سبب ایک شاعر،نظم میں تو اپنے موضوع سے متعلق محسوسات وخیالات کو اس طرح بنتا چلا جاتا ہے کہ اس کے معنی تک رسائی میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔لیکن غزل میں چونکہ عموماً وارداتِ قلبیہ کے حوالہ سے ایک پر اسرار پیرائیہ بیان اظہار خیال کیا جاتا ہے اس لیے اس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔''[۴۰]

ستار وارثی کے نعتیہ شاعری کے مجموعے ''حرفِ معتبر'' (۱۹۹۴ء) کے دیباچے میں نعت گوئی کے فن پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس شعری مجموعے کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔حضور اکرمؐ کے جملہ صفاتی اسمائے گرامی کو عنوان وموضوع بنانے،ہر اسم کی لغوی ومعنوی تشریح دینے،صفاتی اسمائے گرامی کے مکمل پس منظر،قرآن پاک میں ان کی موجودگی کا حوالہ دینے کے حوالے سے ستار وارثی کی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مبارک مونگیری کے مجموعہ کلام ''ذکرِ ارفع'' (۱۹۹۴ء) کے دیباچے میں حضور کریمؐ کی مدح، ان کی شاعری میں برتی گئی جملہ اصنافِ شعری،مثنوی،غزل،مسدس،مخمس،رباعی،تضمین،قطعہ اور جدید نظم میں کہی گئی نعتوں کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ مبارک مونگیری نے حضورؐ کے اوصافِ مبارکہ کی ہمہ رنگی،ہمہ جہتی،کو بیان کرنے کے لیے شعری اصناف کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔

تسنیم فاطمہ کے شعری مجموعے ''لعل بدخشاں'' (۱۹۹۵ء) کے دیباچے میں اس مجموعے میں تسنیم کی ابیات،قطعات، غزلیات اور نظموں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ان کی غزلوں کا پلہ غزلیت،تغزل،لطافت اور کلاسیکی شعریت کی بنیاد پر بھاری قرار دیا گیا ہے۔ان غزلوں میں پائی جانے والی اُردو کلاسیکی شاعری کی لطافتِ احساس،جذبوں کی صداقت،زبان وبیان کے حسن اور تجربے کی تازہ کاری کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے اور غزلوں سے نمونے کے طور پر چند اشعار بھی دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے شعری مجموعے ''صنم کدہ ہے جہاں'' (۱۹۹۶ء) میں شعری مجموعے کے تعارف کے ساتھ اُردو شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر فرمان نے اُردو شاعری کو تین سطحوں میں تقسیم کر کے ہر سطح پر روشنی ڈالی ہے،جس سے ان کی شعر شناسی کا اظہار

ہوتا ہے۔ان کے نزدیک شاعری کی پہلی سطح وہ ہے،جس میں خاص بحر میں الفاظ کے موزوں ہو جانے یا بعض عروضی آہنگوں سے ہم آہنگ ہو جانے کی وجہ سے شاعری میں خاص قسم کی دل کشی پیدا ہو جاتی ہے، چاہے فکر وخیال کی بلندی وندرت پائی جائے یا نہ پائی جائے۔دوسری سطح کی شاعری میں احساس اور جذبے کے سچے اظہار کے ساتھ فکر وخیال کی ایسی ندرتیں پائی جاتی ہیں جو اختراعی ذہن اور بلند قوتِ متخیلہ کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہیں۔تیسری سطح کی شاعری کو وہ بلند ترین سطح کہتے ہیں جس میں فکر ونظر کی رعنائی اور خیال افروزی کے ساتھ کسی خاص آدرش یا مقصد و پیغام کی دعوت بھی ہوتی ہے اور شاعری کو ''جزو ایست از پیغمبری'' کے مرتبے پر فائز کرتی ہے۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی شاعری کا تجزیہ شاعری کی انھی تین سطحوں کو ذہن میں رکھ کر کیا گیا ہے۔عقیل احمد فضا اعظمی کے شعری مجموعے ''جو دل پہ گزرتی ہے'' (۱۹۹۶ء) کے دیباچے میں ان کے کلام کے خارجی وداخلی پہلوؤں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کو زبان و بیان کی سادگی اور عاشقانہ پاکیزہ خیالی کے اعتبار سے کلاسیکی غزل کے رنگ کی شاعری کی حیثیت سے متعارف کرواتے ہیں جس میں وارداتِ قلب، گردشِ دوراں، نیرنگیٔ سیاست کے ساتھ ہم عصر سماجی زندگی کے بارے میں تامل وتفکر کے پہلو نمایاں ہیں۔

سیّد اشتیاق اظہر کے مجموعۂ کلام ''نوشتۂ دیوار'' (۱۹۹۷ء) کے دیباچے میں اظہر کی شاعری میں حسرت موہانی کی شاعری، شخصیت اور کردار کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ان کی غزلوں اور نظموں میں سیاسی وسماجی موضوعات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔م۔اخلاق کے مجموعۂ کلام ''طلسمِ حرف'' میں مجموعے کے عنوان کی مناسبت سے شاعری میں ''حروف'' کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی شاعری میں کم سے کم الفاظ میں معنی بھرنے اور جذبات وخیالات کو مؤثر و دل کش روپ دینے کو شاعر کی فنی مہارت قرار دیا ہے۔''اُڑتی گرد بہار بنی'' (۱۹۹۸ء) مشہود حسن رضوی کا شعری مجموعہ ہے۔اس کے دیباچے میں شاعر کے کلام کو اس کے حقیقی جذبوں، سچے محسوسات، اسلوبِ شعری، ایجاز واختصار اور سادہ اسلوبِ بیان کے تناظر میں متعارف کروایا گیا ہے۔محمد مرسلین شیدا کے مجموعۂ کلام ''مضراب'' (۱۹۹۹ء) کے دیباچے میں کلام کو غزل کی کلاسیکی روایت کے حوالے سے دیکھ کر تجزیہ پیش کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی شاعری کی پاکیزگی، لطافت، حسن و جمال اور شرافت نفسی پر شاعر کی فطرت وسرشتِ مزاج کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اصغر یگانہ کے شعری کلام ''صلیبِ عصر'' (۱۹۹۹ء) کا جائزہ عصری آگہی، عصری حسّیت، عصری واقفیت اور عصری جبریت کی مروّجہ ترکیبوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے اور کلام میں لب ولہجے کے باغیانہ وجارحانہ رویے کے باوجود صداقتوں کی موجودگی اور لفظوں کی دل آویزی سے مزین شاعری قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان دیباچہ لکھتے ہوئے تحریر کے خارجی پہلوؤں اور محرکات پر ہی نظر نہیں رکھتے بل کہ داخلی پہلوؤں اور عوامل کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔بدرالہٰ آبادی کے شعری مجموعے ''بدرِ کامل'' کے تجزیے میں ان کے مرثیوں اور منقبتوں کو ہیئت کے لحاظ سے متعارف کراتے ہوئے انھیں مسدس نما اور قصیدہ طور قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد مرثیے اور قصیدے کے فکری اجزاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔وہ دیباچوں میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعارف کے ساتھ کتاب کے موضوع کی اہمیت، افادیت اور مقاصد کو بھی زیرِ بحث لاتے

ہیں، جس کی بنا پر کتاب کے باقاعدہ مطالعے سے قبل قاری کتاب کے پس منظر سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً شمیم صہبائی متھراوی کی تحقیقی تصنیف ''اُردو واسوخت'' کے دیباچے میں واسوخت کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''تحقیقی کتاب بہ عنوان 'اردو واسوخت' میرے سامنے ہے اور اس کے مطالعے سے اردو شاعری کی پوری تاریخ اپنی جملہ اصنافِ سخن اور تاریخی ادوار کے ساتھ میرے ذہن میں ابھر آئی ہے۔ 'واسوخت' اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے اور اس کی روایت کا سلسلہ بھی دوسری اصناف کی طرح فارسی شاعری سے ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس صنفِ سخن پر اتنا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا جتنی کہ وہ مستحق تھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے اردو کے مشہور ادیب جناب کامل القادری (مرحوم) میری نگرانی میں 'پی۔ایچ۔ڈی' کی سند کے لئے واسوخت پر تحقیقی کام کر رہے تھے اور انھوں نے اپنا مقالہ ہر طرح سے مکمل بھی کر لیا تھا لیکن افسوس کہ وہ اسے یونیورسٹی میں پیش کرنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خدا جانے ان کے مقالے کا مسودہ کس کے پاس ہے۔ اگر یہ شائع ہو جاتا تو اردو تحقیق کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔''[۴۱]

ڈاکٹر فرمان کی اُردو زبان و ادب سے گہری وابستگی اور کتابوں کے مطالعے کا شوق ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان کے بعض دیباچوں سے زبان و ادب، شعر و نثر اور کتابوں کی اہمیت کے بارے میں ان کے افکار و خیالات اور ذوق و شوق کا پتا چلتا ہے۔ زبان کی اہمیت کے بارے میں باغ علی شوق کی تصنیف ''راجستھانی زبان و ادب'' میں لکھتے ہیں:

''سماجی زندگی میں ہمارے درمیان سب سے بڑا اور اہم وسیلۂ اظہار نہ ہوتا تو ہم گونگے بہروں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے اور باہم تبادلۂ خیال سے جو سکون و سرور اور اعانت و رفاقت میسر آتی ہے۔ اس کے لیے ترس جاتے۔ سچ یہ ہے کہ زبان ہی آدمی کو آدمی کے قریب لاتی ہے اور اسی نے وہ سماجی و تہذیبی سانچا تشکیل دیا ہے جس میں ہم اور آپ بسر کر رہے ہیں۔''[۴۲]

اسی طرح وہ فن پارے کو فن کار کے فکری، فنی اور ادبی رجحانات کے ساتھ اس کے عہد، خطے اور تہذیبی و ثقافتی روایات کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں اور جہاں انھیں ایسی کیفیات اور حالات و مشاہدات دکھائی دیتے ہیں، وہاں وہ طمانیت اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے اشفاق حسین کے شعری مجموعے ''اعتبار'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک خیال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی شاعری اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے جو ان کا اپنا عہد ہے۔ جس میں انھوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے اور شعور کو پہنچے ہیں۔ اسی سرزمین کی کہانی ہے جس کی آب و ہوا، مٹی، باغ و راغ سے ان کے دل و دماغ نے جلا پائی ہے، تہذیبی زندگی کی اسی شکست و ریخت اور سیاسی و سماجی زندگی کی اسی گھٹن کی آئینہ دار ہے جس میں شاعر سانس لے رہا ہے، جی رہا ہے جو اس کے عہد کا مقدر معلوم ہوتا ہے، اسی طرزِ احساس اور سوچ کی ترجمان ہے جو اس کے آس پاس کی زندگی نے ردِ عمل کے طور پر اسے بخشتی ہے۔''[۴۳]

معاشرے میں رُونما ہونے والے حالات و واقعات کا شاعر یا ادیب کیا اثر لیتا ہے، اس بارے میں سیّد مہدی حسن حسرت کے شعری کلام ''کشکولِ وفا'' کے دیباچے کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

> ''شاعر یا ادیب معاشرے کے حساس ترین طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی شدید حساسیت اسے گردوپیش کے حالات و واقعات سے بے نیاز گزرنے نہیں دیتی بلکہ زندگی کے جُملہ نشیب و فراز اور اہم مسائل کو موضوعِ سخن بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ سیاسی و سماجی صورتِ حال کا جو اثر عام افراد پر ہوتا ہے، وہ تخلیقی ذہنوں پر کچھ زیادہ ہی شدید اور گہرا ہوتا ہے۔''[۴۴]

اس کے ساتھ انھیں پورا احساس ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے حالات کو ہر فن کار اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لیے نصیر کوٹی کے شعری مجموعے 'لذّتِ آزار' کے دیباچے میں یوں گویا ہوتے ہیں:

> ''حالات کو محسوس کرنے اور محسوسات کو تخلیقی روپ دینے کی روش الگ الگ ہے۔ چنانچہ ہر شاعر نے حالات کو اپنی آنکھ سے اپنے اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھا ہے۔ کسی کے قلب و ذہن پر حالاتِ حاضرہ کی ناسازگاری نے ناخوشگوار اثر ڈالا ہے اور شکوہ و شکایت کے ساتھ بزدلانہ ذہنی کیفیت سے ہم کنار کیا ہے لیکن انہی حالات نے بعض کو جینے کا حوصلہ بخشا ہے اور زندگی کے باب میں رجائی نقطۂ نظر کا حامل بنا دیا ہے۔''[۴۵]

ڈاکٹر فرمان دورِ حاضر کے شعراء کے کلام کا موازنہ اُردو کے نام ور شعرا سے کرتے ہیں تو ان کے کلام کی یکساں خصوصیات کو بیان کرنے کے ساتھ نئے اور انفرادی پہلو بھی سامنے لاتے ہیں۔ جیسے تسنیم فاطمہ کے شعری کلام ''لعلِ بدخشاں'' کے دیباچے میں ان کے کلام کے کلاسیکی پہلوؤں کا تقابلی موازنہ امیر خسرو سے لے کر فراق گورکھپوری تک کی کلاسیکی شاعری سے کرتے ہوئے یکساں خصوصیات کے پائے جانے کے ساتھ تسنیم کے لب و لہجے کی انفرادیت سے متعارف کراتے ہیں۔

احمد حسین صدیقی کی تصنیف ''سیاحتِ ماضی'' میں ادب اور فن پاروں کی تخلیق میں توفیقِ الٰہی اور فطرتی صلاحیتوں کے کردار کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:

> ''تخلیقی ادب یا ادب پارہ شعوری وارادی کوششوں یا علم و فضل کے بل بوتے پر وجود میں نہیں آتا۔ توفیقِ الٰہی میسّر ہو تو یہ خود نوکِ قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ فطرت کا عطا کردہ وہ تخلیقی سوتا، جو دل و دماغ کے کسی گوشے میں پوشیدہ ہوتا ہے کسی خارجی محرک کی مدد سے یک بیک پھوٹ پڑتا ہے اور لکھنے والے کے ایک ایک لفظ، اور ایک ایک صفحے کو اس طرح سیراب و شاداب کرتا چلا جاتا ہے کہ اسے ادب کے سوا کسی اور چیز سے موسوم ہی نہیں کر سکتے۔''[۴۶]

ادبی تحریروں میں اسلوبِ بیان کی اہمیت کے بارے میں اُن کے خیالات کا اندازہ سبوحہ خان کی کتاب ''دلی سے ڈیفنس'' کے دیباچے کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''کوئی ادبی تحریر خواہ وہ کسی چھوٹے قلم کار کی ہو یا بڑے قلم کار کی ہو، محض اس لئے اہم نہیں ہو جاتی کہ وہ کسی خاص ہئیت میں گھری ہوئی ہے اور اپنے اندر علوم وفنون یا فکر وفن کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ مانا کہ کسی تخلیقی تحریر کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے۔ لیکن تخلیقی تحریر کے لیے اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ کس طرح کہی گئی ہے۔ تخلیقی ادب کی چاشنی و دلکشی کا مدار کیا پر نہیں، کیسے پر ہوتا ہے۔ ادب، محض تاریخی و جغرافیائی معلومات یا فلسفیانہ نظریات و مباحث کو یکجا کر دینے سے نہیں خون جگر سے پیدا ہوتا ہے، بظاہر شعوری ہونے کے باوصف، لاشعور کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔''۴۷

شاعری میں شاعر کی شخصیت اور اس کے استعمال کیے گئے الفاظ کے بارے میں شاعر لکھنوی کے مجموعۂ کلام ''زخم ہنر'' کے دیباچے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''شاعری کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن مختصر ترین لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاعری شخصیت کا منہ بولتا رُوپ ہے۔ شخصیت جتنی شائستہ ونفیس اور سنجیدہ ومتین ہوگی اس کا بولتا رُوپ اتنا ہی لطیف ومتین اور سنجیدہ ونفیس ہوگا۔''۴۸

اسی دیباچے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''شاعری کا فن، خواہ اس کا موضوع ومواد کیسی ہی فلسفیانہ گہرائی کیوں نہ رکھتا ہو، اپنی نمود میں الفاظ ہی کا فن ہے۔ جس طرح فنِ رقص اپنی صورت گری کے لیے بدن کی حرکات وسکنات کا محتاج ہے، فن مصوری کو اپنے اظہار کے لیے رنگ وخطوط کی اور جس طرح فنِ موسیقی کو آواز کے زیر و بم کی ضرورت ہے بالکل اسی طرح فنِ شاعری اپنے اظہار کے لیے الفاظ کا دست نگر ہے، چاہے یہ الفاظ سادہ ہوں یا مرکب، تشبیہہ واستعارے کی صورت میں ہوں یا علامات وکنایات کی شکل میں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رفعتِ فکر وخیال کے بغیر صرف لفظوں کی مدد سے تو اچھی بُری شاعری کا امکان رہتا ہے، لیکن الفاظ کے بغیر فکر وخیال کا بلند سے بلند تصوّر بھی شاعری کو جنم نہیں دے سکتا۔''۴۹

شاعری میں الفاظ کی اہمیت کے ساتھ معنی اور جذبات و احساسات کی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں م۔ اخلاق کے مجموعہ کلام ''طلسمِ حرف'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''شاعری اپنے آپ کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے حرفوں کی محتاج سہی لیکن اچھی شاعری لفظوں کی شعبدہ بازی نہیں بلکہ کم سے کم لفظوں میں سے زیادہ سے زیادہ معنی بھر دینے اور جذبات وخیالات کو موثر ودلکش روپ عطا کر دینے کا نام ہے۔''۵۰

غزل کے بارے میں منظر علی خان کے مجموعۂ کلام ''یہ بات چلی مجھ سے'' میں لکھتے ہیں:

''غزل کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے مزاج میں حد درجہ سخت گیر اور لطیف ہے۔ سخت گیر ان معنوں میں کہ اپنے اسلوب خاص یعنی ایمائیت واختصار سے سرِ مو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور لطیف اس اعتبار سے کہ بات مذہب کی ہو سیاست کی، فلسفہ کی ہو یا سماج کی، آج کی ہو یا کل کی، جمال افروزی کی سبک خرام لہروں کو چھوتے ہوئے ترچھے تیکھے انداز سے گزرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔''۵۱

نعت گوئی سے متعلق لکھتے ہیں:

''نعتیہ شاعری یوں بھی جملہ اصنافِ سخن سے مختلف ومنفرد ہے۔اس کے تقاضے زمانے سے الگ اور اس کے لوازم سب سے جدا ہیں۔ جب تک حضور اکرم کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی سے شاعر کے اعمال واخلاق مالا مال نہ ہوں اور اس کا ذہن بشریت والوہیت کی حدود کے فرق سے آشنا نہ ہو وہ شاعری کی دیگر اسالیب واصناف میں تو کمالِ فن دکھا سکتا ہے لیکن نعت گوئی کے منصب سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔نعت گوئی کا راستہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ذرا سا قدم ڈگمگایا، سعیٔ حسنہ کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔''۵۲

کتابوں کی اہمیت اور کتب بینی کی افادیت کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

''کتابیں ہماری جیون ساتھی ہیں۔ہم انہیں چھوڑ بھی دیں تو وہ ہمیں بے یار ومددگار نہیں چھوڑتیں، سوچیے تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے پاس فکر وشعور، علم وفن اور اخلاص واخلاق کے نام سے جو کچھ بھی ہے اس کا زیادہ حصہ کتابوں ہی کا دیا ہوا ہے۔ان کی حیثیت بنی نوع انسان کے لیے وہی ہے جو فرد کے لیے اس کے حافظے کی۔لیکن حافظے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی کیا ہے؟ عام طور پر کتابوں کا عطیہ ہی تو ہے، پھر یہ بھی ہے کہ حافظہ آدمی کے ساتھ فنا ہوجاتا ہے۔کتابیں محفوظ رہتی ہیں اور خود حافظے کی محافظ بن جاتی ہیں۔اس لیے ان کا مقام حافظے کی سطح سے بہت بلند ہوجاتا ہے۔''۵۳

ڈاکٹر فرمان تخلیق کی ظاہری صورت، بناوٹ اور اسلوب پر ہی نظر نہیں رکھتے بلکہ اس کے محرکات، عوامل اور اثرات پر بھی توجہ دیتے ہیں۔انور دہلوی کے مجموعہ کلام ''کشیدِ فکر'' کے دیباچے میں ان کی چند رباعیاں نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''ان اشعار میں قحطِ آب کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پہلی نظر میں قاری کے ذہن کو صحرائے عرب اور میدانِ کربلا کی طرف لے جاتی ہے، لیکن غور کرنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ ان رُباعیوں کا تعلق ماضی کے کسی واقعے یا دُور کے حالات سے نہیں بلکہ بہت قریب کی موجودہ زندگی سے ہے۔''۵۴

ڈاکٹر فرمان کے ہاں کلاسیکی روایت پائی جاتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عصری تقاضوں کی اہمیت سے آگاہ نہیں تھے۔عصری تقاضوں کی اہمیت ونتائج کے بارے ان کی سوچ کیا تھی، اس کا اندازہ ان کے ایک دیباچے میں ان کے اس بارے میں درج ذیل اقتباس سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے؛

''یوں تو ایجاز واختصار کو ہمیشہ، شاعری کا ایک بنیادی وصف سمجھا گیا ہے لیکن قدیم استعارات وتلمیحات اور جدید شعری علامات کی تخلیق، کم سے کم لفظوں میں کہنے کی کوشش ہی میں کی گئی ہے۔فرق یہ ہے کہ قدیم شعرا ایسا کرنے میں آزاد و بااختیار تھے لیکن آج کا شاعر، عصری تقاضوں کے تحت ایسا کرنے پر مجبور ہے۔چنانچہ غزل کا پندرہ سولہ اشعار کی قید سے نکل کر چار پانچ کی حدود میں آجانا، رباعیات وقطعات کا ازسرِ نو مقبول ہونا، جدید نظموں کا سکڑ کر

تین چار مصرعوں تک آ جانا، حمایت علی شاعر کا ثلاثی کہنا، جمیل الدین عالی کا دوہے میں روح پھونکنا، آٹھ رکنی اور چار رکنی مصرعوں کا یک رکنی بن جانا، محسن بھوپالی کا نظمانے کے نام سے زندگی کی لمبی لمبی کہانیوں کو چند مصرعوں میں سمیٹ لینا دراصل اسی عصری تقاضوں کا عطیہ ہے۔''۵۵

ڈاکٹر فرمان اپنے دور کے تنقیدی تقاضوں کی اہمیت اور دوسری زبانوں پر ناقدین کی دسترس کے حوالے سے بھی اپنے دیباچوں میں روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے افکار بھی ان کے دیباچوں میں ملتے ہیں۔ جیسے محسن بھوپالی کے شعری مجموعے ''نظمانے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''آج کا ادیب جسے شعر و ادب کے پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا دعویٰ بھی ہو، پرانے تذکرہ نگاروں کی طرح محض اپنے وجدان یا ذوق پر کلیتاً بھروسہ کر کے کسی ادب پارے پر اچھے یا برے یا معیاری و غیر معیاری ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا۔ آج کی تنقید اس سے بہت آگے بڑھ کر اپنے نقاد سے گہرے سماجی شعور اور وسیع مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ سماجی شعور اور مطالعہ جتنا ہمہ گیر اور پختہ اور دنیا کی مختلف زبانوں سے جتنا ہم رشتہ ہوگا اسی نسبت سے تنقید کی سطح پر فکر انگیزی اور سخن شناسی کی رنگا رنگ تہیں نمودار ہوں گی۔ شاید یہی سبب ہے کہ اردو تنقید میں جن لوگوں کو تیزی سے رتبۂ امتیاز حاصل ہوا۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جن کا مطالعہ صرف اردو تک محدود نہ تھا بلکہ فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبان و ادب پر بھی ان کی دسترس تھی۔''۵۶

ڈاکٹر فرمان کے ہاں اُردو ادب کی کلاسیکی روایت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے، لیکن وہ مشرقی روایات کے ساتھ مغربی روایات کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے۔ مغربی افکار کی اثر پذیری اور اُردو ادب میں اس کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ جہاں ان کی دیگر تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے وہاں ان کے بعض دیباچے بھی اس کے عکاس ہیں۔ جیسے عبدالعلیم صدیقی کے مجموعۂ مضامین ''تقابلی جائزے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی اور ان کے فوراً بعد مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے اپنے عہد کے تقاضوں کے زیر اثر مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی سے بھی فائدہ اٹھایا اور آنے والی نسل کے ادیبوں کو یہ بات سمجھا گئے کہ اب جدید علوم و فنون کا اصل منبع مغرب ہے اور مغرب سے استفادہ کیے بغیر اردو تنقید کا معیار بلند نہ ہو سکے گا۔ یہ نقطۂ نظر جذباتی نہیں بہت سنجیدہ اور سوچا سمجھا تھا، اور شاید اسی لیے بعد کے ادیبوں نے اس کا گہرا اثر قبول کیا۔ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔ نتیجتاً یہ ہوا کہ جو لوگ مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی ادب سے جتنے زیادہ فیض یاب ہوئے اتنی ہی ان کی تنقید بھی مستند ہوتی گئی۔''۵۷

پاکستان منتقل ہونے کے بعد ڈاکٹر فرمان کے ادبی ذوق کی آب یاری کا سامان کیسے ہوا اور کہاں ہوا، اس بارے میں بھی فرمان کے دیباچے آگاہ کرتے ہیں۔ مثلاً نصیر کوٹی کے شعری مجموعے ''شہر آرزو'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''پورے پچیس سال سے پہلے کی بات ہے، کراچی میں نو وارد تھا۔ شہر کے قلب میں، ریگل سینما سے قریب رہتا تھا

اور جمنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ادبی ذوق، انجمن ترقی اردو پاکستان چوک اور ماما پارسی اسکول صدر کی تنقیدی نشستوں میں کھینچ لے جاتا تھا، ان نشستوں میں اس وقت کراچی کے تقریباً سارے ہی ادیب وشاعر جمع ہو جاتے تھے، ایک دوسرے سے سیکھتے بھی تھے اور لے دے بھی کرتے تھے۔ سراج الدین ظفر مرحوم کی شرکت سے ان محفلوں میں خاص طور پر جان پڑ جاتی تھی۔ ماما پارسی اسکول، میری رہائش گاہ سے ملا ہوا تھا اس لیے اس کی ادبی مجلسوں میں شرکت آسان تھی۔ ان محفلوں میں گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔'' ۵۸؎

ڈاکٹر فرمان کے دیباچوں میں کہیں کہیں خالص مدرسانہ طرزِ خطابت بھی ملتا ہے۔ درس وتدریس سے گہری وابستگی کی بنا پر مدرسانہ رنگ کا پایا جانا بعید از قیاس بھی نہیں، کیوں کہ وہ بنیادی طور پر اُردو کے ایک اُستاد تھے۔ مدرسانہ رنگ کی ایک مثال شمیم صہبائی کی کتاب ''اُردو واسوخت'' کے دیباچے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جس میں وہ ''واسوخت'' پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ لگتا ہے وہ اپنے سامنے بیٹھے اُردو زبان وادب کے طلبا کو لیکچر دے رہے ہیں ڈاکٹر فرمان کا خطیبانہ اسلوب ملاحظہ کیجیے:۔

''اردو شاعری کی اصطلاح میں 'واسوخت' سے مراد ایسی نظم یا اشعار سے ہے جس میں محبوب کی وفاداری وتوجہ سے مایوس اور اس کی بے اعتنائی و بے رخی سے مجبور ہو کر شاعر اسے طعن وتعریض کا نشانہ بناتا ہے۔ شکوے شکایت کرتا ہے۔ آدابِ عاشقی کے برعکس، اسے جلی کٹی سناتا ہے۔ غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے۔ تلملاتا ہے، کڑھتا ہے، بپھرتا ہے، مغلظ بانہ برا بھلا کہتا ہے۔ ان باتوں کا مقصود، حقیقتاً محبوب کو اپنی طرف متوجہ اور دلداری والتفات پر دوبارہ آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر ان باتوں کا بھی اثر نہ ہوا تو وہ محبوب کو جلانے اور اس سے انتقام لینے کی غرض سے کسی دوسرے محبوب سے دل لگانے کی دھمکی دیتا ہے یا واقعی کسی دوسرے کا ہو جاتا ہے۔ اس کے حسن وجمال اور دل جوئی ووفا داری کے گن گاتا ہے۔ ایک ایک بات، ایک ایک ادا کی تعریفیں کرتا ہے اور ایسا سماں باندھتا ہے گویا دوسرا محبوب انتخابِ زمانہ اور پہلے محبوب سے ہزار گنا حسین وجمیل ہے۔ ایسا کرنے سے کبھی تو پہلا محبوب راہِ راست پر آجاتا ہے اور یہ عذر کر کے کہ اس کی بے اعتنائی اور بے رخی محض آزمائش کے لئے تھی، روٹھے ہوئے عاشق کو منالیتا ہے اور اس طرح محبت کی فضا ایک بار پھر طرب ناک وسازگار ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر عاشق کے طنز وتشنیع کا محبوب پر کوئی اثر نہ ہوا تو عاشق کی زندگی المیہ بن جاتی ہے یا پھر وہ کسی اور سے دل لگا کر لطف ونشاط کی راہیں نکال لیتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ سچائی وخلوص پر مبنی ہو تو شاعر کی باتوں اور کلام میں خود بخود ایک طرح کا سوز وگداز پیدا ہو جاتا ہے اور اگر یہ سارا کھیل ہوس ناکی ومکاری کا نتیجہ ہو تو شاعری بے جان رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ اردو میں جس نظم کو 'واسوخت' کہتے ہیں، وہ دراصل عاشق ومعشوق کے درمیان چونچلے اور معاملہ بندی کی بڑھتی ہوئی بلکہ حد درجہ مبالغہ آمیز صورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، وہ سب کی سب بہ یک وقت کسی واسوخت میں موجود ہوں۔ صرف یہ کہ موضوع کے اعتبار سے واسوخت میں اس قسم کی باتوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ چنانچہ واسوخت کی اب تک جتنی تعریفیں کی گئیں وہ الفاظ کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اسی نوع کی ہیں۔'' ۵۹؎

دیباچوں کا اصل مقصد کتاب اور صاحبِ کتاب کا اس طرح کا ماہرانہ تعارف ہوتا ہے جس میں دونوں کے بارے میں

بنیادی معلومات سامنے آجائیں اور کتاب کے موضوع کے حوالے سے عام قاری کی مناسب رہنمائی ہو سکے۔ کتاب میں موضوع کے حوالے سے رہ جانے والی کسی کمی یا تشنگی وغیرہ کو دور کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان پوری کے لکھے گئے دیباچوں میں یہ چیز دکھائی دیتی ہے۔ وہ کتاب اور صاحبِ کتاب کا تعارف کراتے ہیں اور دونوں کے تعارف میں ضروری نکات بیان کرتے ہیں۔ اصغر کاظمی کی مرتبہ کتاب ''مولانا حسرت موہانی غزل گوئی کے آئینے میں'' کے دیباچے میں کتاب کے موضوع کے حوالے سے ان کی شاعری کو بنیادی طور پر حسن و جمال اور عشق و محبت کی شاعری قرار دیتے ہوئے ان کے کلام کو دو حصّوں سیاسی و عشقیہ میں منقسم کر کے بیسویں صدی کی غزل گوئی کے امام کے طور متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کی شاعری نے اُردو غزل کو گھٹن کی فضا سے نکال کر آزاد فضا میں سانس لینے اور پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ عاشقانہ غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں سیاسی رنگ کی غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ہر چند کہ حسرت کی ساری زندگی عملی سیاست میں گزری لیکن ان کی شاعری پر سیاست کا اتنا گہرا اثر نہیں جتنا کہ عشق و محبت کا۔''[۶۰]

(۶)

ڈاکٹر فرمان نے اپنی بیش تر کتابوں پر خود دیباچے تحریر کیے ہیں۔ ان کی کتاب ''اُردو قومی یک جہتی اور پاکستان'' وہ واحد کتاب ہے، جس کا دیباچہ انھوں نے خود نہیں لکھا۔ اس کتاب کا دیباچہ ''مقدمہ'' کے عنوان سے جمیل الدین عالی مرحوم نے تحریر کیا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی نے شائع کی۔ ''اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' وہ واحد کتاب ہے جس کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ انھوں نے حسبِ روایت ''کتاب سے پہلے'' کی بجائے ''پیش لفظ'' کے عنوان کے تحت لکھا۔ تاہم طبع دوم میں مختصر دیباچہ ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان ہی سے درج ہے۔ اور ''حرفے چند'' کے عنوان سے جمیل الدین عالی کا لکھا دیباچہ بھی شامل ہے۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کی اشاعت دوم میں ڈاکٹر فرمان کے اپنے دیباچے بہ عنوان ''کتاب سے پہلے'' کے علاوہ ''حرفے چند'' کے عنوان سے جمیل الدین عالی کا تحریر کردہ دیباچہ شامل ہے۔ ان دونوں کتابوں کے وہ ایڈیشن، جو انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوئے، ان کے دیباچے جمیل الدین عالی نے انجمن کے معتمد اعزازی ہونے کی حیثیت سے تحریر کیے۔ ان کی کتاب ''اُردو املا و قواعد'' (طبع اوّل، ۱۹۹۰ء) کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا، لیکن اس کے ساتھ ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کا لکھا ہوا اپنا دیباچہ بھی شامل ہے۔ ''تحقیق و تنقید'' میں کتاب سے پہلے کے ساتھ لفظ دیباچہ بھی ملتا ہے۔ ''اُردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء'' میں دیباچہ ''کتاب سے پہلے، دیباچہ'' کے عنوان سے اور ''ہندی اُردو تنازع'' میں دیباچہ ''کتاب سے پہلے، مقدمہ'' کے عنوان سے ملتا ہے۔ ان کی تصنیف ''اُردو کے چار بڑے شاعر'' دیباچے کے بغیر شائع ہوئی۔

ڈاکٹر فرمان نے مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ اپنی کتابوں پر جتنے دیباچے قلم بند کیے ہیں، ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان کے تحت قلم بند کیے اور ان میں سے زیادہ تر میں کتاب اور اس کے مشمولات کے بارے میں تعارفی سطور تحریر کی گئی ہیں۔ البتہ ان میں سے

بعض کتابوں کے دیباچوں میں کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ایسے حقائق بھی بیان کیے ہیں جو ان کی نثر نگاری کے آغاز کے بارے میں معلومات سامنے لانے کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً ان کے پہلے تحقیقی مقالے ''اُردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقا'' (مطبوعہ ۱۹۶۲) کے دیباچے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے بی۔اے کے زمانۂ طالب علمی سے اُردو زبان وادب کی بیش تر اہم کتابوں کو زیرِ مطالعہ لے آئے تھے۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۹ء۔۱۹۵۰ء میں بی۔اے کے امتحان کی تیاری کے دوران جب انھوں نے ''شعر العجم'' سے نوٹ لینے چاہے تو انھیں اُردو رباعی پر کوئی مواد نہ مل سکا، اور اسی صورتِ حال کا انھیں ''کاشف الحقائق''، ''تاریخ ادبِ اردو'' اور ''آبِ حیات'' میں بھی سامنا کرنا پڑا۔[۱] تحقیقی وتنقیدی مضامین اور مقالے لکھنے کے لیے وسیع مطالعے اور معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے معلومات حاصل کرنے کے طریقِ کار بھی دیباچے سے ظاہر ہوتے ہیں، جب وہ لکھتے ہیں کہ رباعی سے متعلق مواد کے بارے میں جاننے کے لیے انھیں علم وادب کے پُرکھوں سے رجوع کرنے کا خیال آیا اور مولانا حامد حسن قادری، مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالکلام آزاد سے خط وکتابت کرنی پڑی اور قدیم اُردو، فارسی تذکروں، ادبی تاریخوں اور کتابوں کو کھنگالنا شروع کیا اور دو تین سال کے عرصے میں جو کچھ جہاں کہیں سے ملا، اسے جمع کیا۔[۲] علامہ نیاز نے نگار کے ''اصناف سخن'' نمبر، جولائی ۱۹۵۶ء کے لیے انھیں رباعی کے موضوع پر لکھنے کا کام سپرد کیا، تو سارا مواد یک جا کرنے کا موقع ہاتھ آیا اور جب کراچی یونیورسٹی سے اُردو رباعی پر ایم۔اے کا مقالہ جمع کرانے کی اجازت ملی تو جنوری ۱۹۵۸ء میں انھیں مفصل ومنظم طریقے سے کام ترتیب دینے کا موقع ملا۔[۳] اس دیباچے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس موضوع پر بعض معاملات میں انھوں نے مراسلات کے ذریعے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے اور بعض اُمور میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، جوش ملیح آبادی، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، علی اختر حیدری اور مولانا ماہر القادری جیسے بزرگوں سے مل کر استفادہ کیا۔ اس طرح اس دیباچے سے جہاں رباعی اور رباعی کی تاریخ، موضوع کی اہمیت اور کتاب کے بارے میں معلومات ملتی ہیں، وہیں صاحب کتاب کی ادبی زندگی اور ان کی کوششوں کا بھی پتا چلتا ہے اور اس طرح دیباچے نے تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ڈاکٹر فرمان اپنی کتابوں کے دیباچوں میں کتاب کے موضوع سے متعارف کروانے کے ساتھ بعض اوقات ادب کے بارے میں اپنے افکار کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح کی صورت ان کے پہلے مجموعۂ مضامین ''تحقیق وتنقید'' کے دیباچۂ اوّل (۱۹۶۳ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے مجموعۂ مضامین ''عملی تنقیدیں'' کے دیباچے میں ان کے تنقید وتحقیق کے حوالے سے افکار کا پتا چلتا ہے۔ دیباچے میں ادبی تحقیق اور تنقید کا آپس میں گہرا تعلق بتایا گیا ہے اور ان دونوں کی باہمی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یوں تو ''تحقیق وتنقید'' میں بہ اعتبارِ معنی کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ تحقیق کے معنی ''حق کی تلاش وتصدیق'' کے ہیں۔ تنقید کا لفظ بھی کم وبیش یہی معنی دیتا ہے۔ پھر بھی علمی وادبی مباحث میں یہ الفاظ نمایاں معنوی فرق کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ تحقیق عموماً خارجی وتاریخی واقعات اور الفاظ ومحاورات کی چھان بین پر نظر رکھتی ہے۔ اس کے

برعکس تنقید کسی ادبی تخلیق کے حسنِ اندروں کو نگاہ میں رکھ کر اس کے معیار و حلقۂ اثر کا تعین کرتی ہے۔ لیکن دوسرے علوم پر قیاس کر کے ادب کو تحقیق و تنقید کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ جب تک وثوق سے یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی ادب پارہ کس کی تخلیق ہے، کب اور کن حالات میں وجود میں آئی ہے اور جس زبان سے اس کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کے کیا اصول ہیں اس وقت تک تنقید کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اسے قدم آگے بڑھانا ہے تو تحقیق کا سہارا لینا ہوگا۔ یہی حال تحقیق کا ہے۔ تنقیدی شعور سے بے نیاز رہ کر وہ اپنی ادبی اہمیت نہیں منوا سکتی۔ اگر اسے ادب کا مستقل جز و بننا ہے تو غیر ضروری مسائل کو نظر انداز کر کے صرف اہم اور افادی امور کو ادبی تحقیق کا موضوع بنانا ہوگا۔'' ۶۴

تنقید، اس کی اقسام اور اس کے طریقِ کار کے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ ''عملی تنقیدیں'' کے دیباچے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس دیباچے میں عملی تنقید اور نظری تنقید کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے عملی تنقید کو نظری تنقید کے مقابلے میں مشکل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عملی تنقید کا کام، نظری تنقید کے مقابلے میں نسبتاً مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظری تنقید عموماً دوسروں کے اقوال و افکار اور خیالات و نظریات یا خارجی مصادر و ماخذ کو رہنما بنا کر آگے بڑھتی ہے اور بسا اوقات دیکھا یہ گیا ہے کہ اس طرزِ عمل سے بات سلجھنے کے بجائے مزید الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس، عملی تنقید میں اپنے زیرِ قلم موضوع و مواد کے بارے میں براہ راست گفتگو کرنی پڑتی ہے اور فکر و فن کے بارے میں دوٹوک رائے دینا ضروری ہو جاتا ہے۔'' ۶۵

تاثراتی تنقید کے بارے میں ڈاکٹر فرمان کا کہنا ہے کسی بھی ادبی تنقید کو چاہے اس کا تعلق فکر و نظر کے اعتبار سے کسی بھی قسم کی تنقید سے کیوں نہ ہو، اسے تاثرات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس بارے میں ان کی سوچ ملاحظہ ہو:

''ادبی تنقید کو خواہ اس کا تعلق بہ اعتبار فکر و نظر کسی نوع کی تنقید سے ہو، تاثر سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ سائنس و فلسفہ اور بعض دوسرے نظری علوم کی بحث و تنقید میں ذاتی تاثر کا دخل یقیناً عیب کہلائے گا لیکن تخلیقی ادب کی تنقید، خواہ کہنے کے لیے وہ کتنی ہی معروضی کیوں نہ ہو، تاثر کی آمیزش سے خالی نہیں ہو سکتی۔'' ۶۶

تنقید میں تحقیق کے عمل دخل کے بارے میں فرمان فتح پوری کی فکر کا پتا بھی ان کے اس دیباچے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر کتاب [عملی تنقیدیں] میں نثر اور شعر دونوں کے بارے میں تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ دونوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے ان کے موضوع و مواد کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ ایسا کرنا یوں بھی ضروری تھا کہ جب تک کسی نثر پارے یا شعری تخلیق کے بارے میں وثوق سے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب، کیسے، کن حالات میں اور کن محرکات کے تحت وجود میں آئی ہے اس پر تنقید کا عمل مناسب و کارگر نہیں ہو سکتا۔'' ۶۷

ڈاکٹر فرمان بعض اوقات دیباچوں میں مباحث، دلائل اور تاریخی و ادبی حوالے اس طرح شامل کرتے ہیں کہ مطالعہ کرتے وقت ایسا لگتا ہے، جیسے کسی تحقیقی وتنقیدی مضمون کا مطالعہ کیا جارہا ہو۔ اپنے بیانات کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر حوالے بھی دیتے ہیں۔

''اقبال سب کے لیے'' (۱۹۷۸ء) کے گیارہ صفحات پر مشتمل دیباچے میں کتاب کے تعارف، وجہِ تصنیف اور مشمولات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ دیباچہ مباحث کے سبب مقالے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جس میں باقاعدہ حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

''اُردو افسانہ اور افسانہ نگار'' (۱۹۸۲ء) کا دیباچہ بھی ایک تحقیقی وتنقیدی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں اُردو افسانے اور افسانہ نگاروں کے بارے میں معلومات مستند حوالوں کے ساتھ دی گئی ہیں۔ ''اُردو شاعری کا فنی ارتقاء'' (۱۹۹۰ء) میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رُباعی، واسوخت، ریختی، قطعہ، گیت، شہر آشوب، منظوم ڈرامہ، سانٹ، دوہا، پیروڈی اور ہائیکو کے عنوانات کے تحت ان اصناف کے بارے میں اُردو زبان کے نام ور ادباء کے مضامین اور مقالے شامل کیے گئے ہیں۔ دیباچے میں امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے لے کر جدید جاپانی صنف نظم ''ہائیکو'' تک کی اُردو شاعری کو موضوع بحث بناتے ہوئے مختلف اَدوار میں اُردو شاعری کے فروغ، ہیت اور موضوعات کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں، اضافوں اور مقبولیت کے بارے میں حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان اصناف کی تیکنیک، ہئیت، خصوصیات، فنی لوازم اور ان کے ارتقائی مدارج کے بارے میں تفصیلات کی کسی ایک جگہ نہ پائے جانے کے سبب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب کو مرتب کیا گیا۔

''ادبیات وشخصیات'' (۱۹۹۳ء) کے دیباچے میں کتاب میں شامل تحریروں کی نوعیت اور ان کی نمایاں خصوصیات سامنے لانے کے ساتھ ان میں مذکور شخصیات کے حوالے سے تاثرات بیان کیے ہیں۔ دیباچہ تاثراتی مضمون کی شکل اختیار کر گیا ہے، جس میں تاثرات کو تنقیدی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''جن شخصیات کے بارے میں کہا گیا ہے وہ سب کی سب اتنی معزز و موقر اور مستند و محکم ہیں کہ میرے ہم عصروں ہی کو نہیں، بلکہ میرے بعد کی نسلوں کو بھی ذہنی وفکری بقا و ارتقا کی لیے اور اپنی تہذیبی و ثقافتی اور تعلیمی اور تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لیے، ان کو پڑھنا پڑے گا اور ان کے خیالات و افکار سے خود کو ہم رشتہ رکھنا ہوگا۔ ادبیات و شخصیات میں شامل مضامین کی ایک بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں، جن شخصیات کا ذکر آیا ہے وہ اپنی سیرت کی پختگی، کردار کی استقامت، علم وفضل کی وسعت، ملک وملت سے وابستگی اور اپنی تہذیبی تاریخ سے غیر معمولی لگاؤ کی بنا پر حد درجہ متنوع ہیں۔ اس تنوع کے سبب کتاب کے موضوعات یک رخے نہیں رہے بلکہ اپنی رنگارنگی کے سبب ہماری زندگی کے بیشتر شعبوں پر محیط ہو گئے ہیں۔''[۶۸]

اپنی کتاب ''غزل اُردو کی شعری روایت'' (۱۹۹۵ء) کے دیباچے میں اُردو غزل کی روایت کا اُردو شاعری کی قدیم اصناف

مثنوی، قصیدہ، رباعی، واسوخت، طویل قطعات، مرثیہ اور مغرب کے زیرِ اثر جدید نظم کے مقابلے میں مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ غزل کی ہیئت، موضوعات، اسلوبِ اظہار اور اس کی معنی آفرینی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں کتاب کے موضوع کے حوالے سے یوں اظہار خیال ملتا ہے:

''اس انتخاب میں علامہ اقبال کے سوا کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو غزل کے سوا کسی دوسری صنفِ سخن میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔ ولی، درد، میر، غالب، حسرت، جگر، فراق اور مجروح نے یوں تو کہنے کے لیے بھی بہت کچھ کہا ہے لیکن ان کی وجہِ شہرت یا طرۂ امتیاز، غزل اور صرف غزل ہے، علامہ اقبال نے یقیناً غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی مقبولیت و ناموری میں غزل سے زیادہ نظم کا حصہ ہے۔ پھر بھی ان کی غزل نظم سے کم درجے کی نہیں ہے۔''۶۹

''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' (۱۹۹۵ء) کا دیباچہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر فرمان نے غالب اور کلام غالب سے اپنی دل چسپی، غالب کے موضوع پر اپنے پہلے مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام''، اس سے جڑے واقعات، اپنے ایک اور مضمون ''کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار'' کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ اس دیباچے میں ڈاکٹر فرمان نے غالب کو اپنے ایسے راہبر و راہ نما کے طور پر متعارف کرایا ہے، جن کی راہبری انھیں اپنے ادبی سفر کے آغاز ہی سے میسر آ گئی تھی۔ لکھتے ہیں:

''تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعوری خانے کا اہم جزو بن گئے۔ پھر جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہ نما اور مشکل کشا بن گئے۔ اگر تعلّی سے تعبیر نہ کیا جائے تو عرض کروں کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی بلکہ آغازِ سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا۔''۷۰

''تعبیرات غالب'' (۲۰۰۲ء) کے دیباچے میں غالب کی اپنائی جانے والی اُردو، فارسی اصناف، نظم و نثر میں ان کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی توجیہ و تفہیم اور سماجی و سیاسی رویّوں کے بارے میں بصیرت سے متعارف کرایا ہے۔

دیباچے میں کتاب کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے کہ کتاب کی وجہِ تصنیف اور موضوع کی اہمیت و افادیت سامنے آ جائے تاکہ قاری کتاب اور اس کے مشمولات کے بارے میں باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے سے قبل آگاہی حاصل کر سکے۔ ''تنقیدی شذرات و مقالات'' (۲۰۰۵ء) کے دیباچے میں کتاب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

''پہلے ادبی ملاحظات آپ کی نظر سے گزریں گے پھر سیاسی۔ باب المراسلہ، باب الاتفاق اور باب الاستفسار کے تحت لکھی گئی تحریریں اپنی اصل صورت میں دیدی گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کئی اعتبار سے قاری کی دلچسپی کا باعث

بنیں گی۔ ''مطبوعات موصولہ'' کے تحت نئی کتابوں پر تبصرے ہیں۔ یہ تبصرے بھی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ بعض موضوعات و مسائل کے حوالے سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کریں گے۔ اس جگہ یہ واضح کرتا چلوں کہ زیرِ نظر کتاب میں میری صرف وہ تحریریں شامل ہیں جو نگار یا نگار پاکستان میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیان باب المراسلہ (اداریہ)، ملاحظات، باب الاستفسار، باب الانتقاد اور مطبوعات موصولہ کے تحت لکھی گئیں، ان میں چند تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔''[۱]

''اُردو فکشن کی مختصر تاریخ'' (۲۰۰۶) کے دیباچے کی ابتدائی سطور میں اپنی کتاب کے عنوان میں استعمال انگریزی لفظ فکشن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکشن، انگریزی زبان کا لفظ سہی، لیکن اب اسے بے شمار دوسرے انگریزی لفظوں کی طرح اُردو ہی کا سمجھنا چاہیے۔ اوّل اس لیے کہ ایک عرصے سے اُردو میں مستعمل ہے۔ دوسرے یوں کہ اس کا مترادف و متبادل نظر نہیں آتا۔ تیسرے اس واسطے کہ صوتی اعتبار سے یہ خوش آہنگ ہے اور اسے اپنا لینے میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہوتی، چنانچہ جب میں اُردو کا افسانوی ادب کہتا ہوں تو میری مراد اُردو فکشن سے ہوتی ہے۔''[۲]

اس کے بعد اُردو فسانوی ادب کے قدیم ترین نمونے داستان کو متعارف کراتے ہیں۔ داستان کے بعد ڈرامے، ناول اور افسانے پر اظہار خیال ملتا ہے۔

''ادبی تنقید کے نئے دریچے'' (۲۰۰۷ء) کے دیباچے میں کتاب کے مشمولات کے حوالے سے معلومات فراہم کرنے کے بعد کشادہ دلی سے اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ کتاب کی پیش کش میں ان کا صرف اتنا حصہ ہے کہ اس میں شامل مضامین ان کے تحریر کیے ہوئے ہیں، جب کہ اس کتاب کے شائع ہونے تک کے تمام مراحل ڈاکٹر عامر سہیل صاحب نے سرانجام دیے ہیں۔

''چند نعت گویانِ اُردو'' (۲۰۱۰ء) کے دیباچے کے آغاز میں نعت کا مفہوم بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد کتاب کے مشمولات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب نعت کے حوالے سے ان کے لکھے گئے مضامین، دیباچوں اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ ان بکھرے ہوئے مضامین، دیباچوں اور تبصروں کو یک جا کر کے نعت گوئی کے حوالے سے مواد کو یک جا کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح قاری کو کتاب کے مطالعے سے قبل آگاہی ہو جاتی ہے کہ زیرِ مطالعہ کتاب میں مضامین کی نوعیت اور حقیقت کیا ہے۔

''ادب اور ادب کی افادیت'' کے دیباچے میں کتاب سے متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مجموعے کے کچھ مضامین کا تعلق تنقید اور عملی تنقید سے ہے اور کچھ کا تحقیق و تنقید دونوں سے، البتہ بعض مضامین خالصتاً ادبی تحقیق سے متعلق ہیں۔ ایک سفر نامہ بھی بالاختصار اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ سب مل کر مطالعہ ادبی کے لیے فکر و نظر کا ایک دائرہ بناتے ہیں، اور میرے زاویہ نظر سے اس دائرے میں وہ ساری اونچ نیچ سما گئی ہے جو پچھلے چند برسوں میں اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئی ہے۔ یقین ہے کہ یہ اونچ نیچ اس کتاب کے قارئین کو اپنے گرد و پیش کی ادبی فضا کو سمجھنے اور اسے احساس کی سطح پر ابھارنے میں مدد دے گی۔''[۳]

اپنی کتاب ''صرف شاعرات'' (۲۰۰۹ء) کے دیباچے میں اُردو سمیت دنیا کی دوسری زبانوں کی شعری تاریخ میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شعر و ادب میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی مساوی حصہ لیا اور اُردو زبان میں بھی یہی صورت حال ملتی ہے۔

اپنی کتابوں پر دیباچوں میں مصنفین اپنی کتاب کے موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تا کہ کتاب اور کتاب کے موضوع کے حوالے سے ان کا مؤقف سامنے آ سکے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اپنی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں میں یہی طریق کار دکھائی دیتا ہے۔ اپنی خودنوشت ''بلا جواز (کچھ اپنے بارے میں)'' (۲۰۱۱ء) کے دیباچے میں اُردو خودنوشتوں کے بارے میں اپنے تاثرات کے اظہار کے ساتھ اپنی خودنوشت میں اختیار کیے جانے والے طریقے کی وضاحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے، سچ لکھا ہے، لیکن اس قدر جس قدر ان سے ممکن تھا۔ (۴۷) اپنی تصنیف ''اُردو کی بہترین مثنویاں'' (۲۰۱۲ء) کے دیباچے میں کتاب میں شامل تین مثنویوں ''سحر البیان'' از میر حسن، ''گلزار نسیم'' از دیا شنکر نسیم اور ''زہر عشق'' از نواب مرزا شوق کا مطالعہ پیش کرنے کا مقصد بیان کیا ہے اور مطالعے کی نوعیت کو تحقیقی و تنقیدی قرار دیتے ہوئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

(۷)

مذکورہ صفحات میں ڈاکٹر فرمان کی دیباچہ نگاری کا جو جائزہ پیش کیا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان کے دیباچے فنِ دیباچہ نگاری کے مروجہ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے دیباچوں میں کتاب اور صاحبِ کتاب کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے کہ قاری کتاب کے باقاعدہ مطالعے سے قبل ان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ کتاب کی اہمیت، افادیت اور مقاصد بھی واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اس طرح جہاں دیباچہ قاری کے لیے راہنمائی کا سبب بنتا ہے، وہیں کتاب کے مطالعے کی ترغیب کا باعث بھی بنتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے دیباچوں میں مختصر دیباچے بھی ملتے ہیں اور طویل دیباچے بھی، لیکن ان کے اختصار یا طوالت سے قطع نظر ان دیباچوں میں صرف کتاب اور صاحبِ کتاب کا تعارف ہی نہیں ملتا بلکہ ان میں موضوع کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور مقصد ہمیشہ ادبی و افادی ہوتا ہے۔ ناقدانہ رائے کے ذریعے خوبیاں اجاگر ہو کر سامنے آتی ہیں تو کتاب میں موضوع کے حوالے سے تشنہ رہ جانے والے پہلوؤں کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اُردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت کی طرح ڈالی۔ ان کے لکھے گئے ادبی مقدمات میں فن کار اور فن پارے کے مکمل تعارف کے ساتھ فن پارے کی جملہ خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ تعارف کے ساتھ تنقیدی و تحقیقی مواد بھی پایا جاتا ہے۔ اس روایت کے موجد مولوی عبدالحق تھے اور ان کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی یہ روایت بھی کمزور پڑ گئی، تاہم ڈاکٹر فرمان کے دیباچوں میں کم و بیش یہ روایت ملتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے دیباچوں میں تنقید و تحقیق اور ادبی تاریخ کا شعور دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں بعض ایسے دیباچے ملتے ہیں جو انھوں نے مروتاً لکھے ہیں، لیکن ان کے لکھے گئے زیادہ تر دیباچے کتاب کے موضوع کے حوالے سے معروضی تنقید کا نمونہ ہیں اور ان میں فن پاروں کے موضوعات کے حوالے سے تنقیدی و تحقیقی بحث ملتی

ہے۔ڈاکٹر فرمان فن دیباچہ نگاری سے پوری طرح آگاہ تھے اور دیباچوں کے لیے جس وسعتِ مطالعہ،علمی و ادبی بصیرت اور ناقدانہ صلاحیتوں اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے شعری ونثری موضوعات پر مبنی تصانیفات وتالیفات پر نہایت مہارت کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور حق ادا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان کی دیباچہ نگاری کا فلیور مختلف ہے۔ انھوں نے جتنے بھی دیباچے تحریر کیے ان کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دیباچے شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے لکھے۔لیکن اس کے باوجود ان کے دیباچے تقریظی نوعیت کے نہیں ہیں اس میں تحقیق ،تنقید، تجزیہ، تاریخی اور خاکہ نگاری کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ یہی خوبیاں ان کی دیباچہ نگاری کو منفرد کرتی ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر اشرف کمال، ''تاریخ اصناف نظم ونثر''، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۵۶۹۔

۲۔ فیروز اللغات اُردو، فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور، س ن۔

۳۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، ''فرہنگِ ادبی اصطلاحات''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۸۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔

۵۔ (http://www.webster-dictionary.org/definition/Foreword)

۶۔ (http://www.webster-dictionary.org/definition/Preface)

۷۔ ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ''اُردو تقریظ نگاری''، مشمولہ تحقیق، شعبۂ اُردو، سندھ یونیوسٹی، شمارہ ہشتر کہ ۱۲۔۱۳، جام شورو، ۹۹۔۱۹۹۸ء، ص ۹۵۔۷۔

۸۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''اردو تنقید کا ارتقا''، اشاعت پنجم، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۸۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۱۰۔ ''قومی زبان''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۷۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ڈاکٹر نجیب جمال، ''کتاب کے بعد''، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۔

۱۴۔ ڈاکٹر اشرف کمال، ''تاریخ اصناف نظم ونثر''، ص ۵۷۰۔

۱۵۔ آل احمد سرور، ''تنقید کیا ہے؟''، مکتبہ جامعہ ملیہ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۹۳۔

۱۶۔ ڈاکٹر نجیب جمال، ''کتاب کے بعد''، ص ۲۶۔

۱۷۔ ارم سلیم: ''اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۲۔

۱۸۔ عبدلرزاق قریشی: مرتب، ''دیوان عزلت''، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۹۔۱۸۰۔

۱۹ ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، طبع دوم، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۴ء۔ص ۴۲۷۔

۲۰ ایضاً۔

۲۱ ایضاً، ص ۴۳۲۔

۲۲ ایضاً۔

۲۳ پیش لفظ از محمود علی، مشمولہ ''الہلال کے تبصرے''، مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص ۳۔

۲۴ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ''ادبیات و شخصیات''، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۔

۲۵ ایضاً، ص ۲۰۔

۲۶ ایضاً، ص ۲۱۔

۲۷ ایضاً، ص ۲۲۔

۲۸ ایضاً، ص ۲۳۔

۲۹ حکیم نثار احمد علوی، ''سخنواران کاکوری''، میخانۂ ادب، کراچی، س ن، ص ۱۲۔

۳۰ علامہ نیاز فتح پوری، ''غالب شخصیت و فن''، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ن۔

۳۱ سیّد محمد جعفری، ''شوخیٔ تحریر''، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۔

۳۲ سیّد محمد اصغر کاظمی: مرتب، ''تنقید نما''، جلد اوّل، فرید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۔

۳۳ ایضاً، ص ۳۴۔

۳۴ ایضاً، ص ۳۸۔

۳۵ ایضاً، ص ۵۵۔

۳۶ سیّد محمد اصغر کاظمی: مرتب، ''تنقید نما''، جلد دوم، حرافا ؤنڈیشن پاکستان، کراچی، س ن، ص ۴۲۔

۳۷ ایضاً، ص ۹۹۔

۳۸ ایضاً، ص ۳۵۔

۳۹ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۴۰ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۴۱ ایضاً، ص ۸۸۔

۴۲ ایضاً، ص ۶۱۔

۴۳ ایضاً، ص ۱۵۲۔

۴۴ ایضاً، ص ۲۱۱۔

۴۵ ایضاً، ص ۲۳۰۔

۴۶۔ ایضاً،ص۱۱۹۔
۴۷۔ ایضاً،ص۶۰۔
۴۸۔ تنقیدنما،جلداوّل،ص۱۳۳۔
۴۹۔ ایضاً،ص۱۳۵۔
۵۰۔ ایضاً،ص۳۰۰۔
۵۱۔ ایضاً،ص۲۸۰۔
۵۲۔ ایضاً،ص۱۰۲۔
۵۳۔ ڈاکٹر نجیب جمال،''کتاب کے بعد''،ص۵۳۔
۵۴۔ تنقیدنما،جلداوّل،ص۱۹۹۔
۵۵۔ ایضاً،ص۱۵۸۔
۵۶۔ ایضاً،ص۲۳۔
۵۷۔ ایضاً،ص۲۳۔
۵۸۔ ایضاً،ص۱۲۳۔
۵۹۔ ایضاً،ص۹۲۔
۶۰۔ سیّد محمد اصغر کاظمی،''مولانا حسرت موہانی غزل گوئی کے آئینے میں''،حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)،کراچی،۲۰۱۳ء،ص۵۔
۶۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری،''اُردو رباعی،فنی وتاریخی ارتقاء''،مکتبۂ عالیہ،طبع چہارم،لاہور،۲۰۰۱ء،ص۱۴۔
۶۲۔ ایضاً،ص۱۵۔
۶۳۔ ایضاً،ص۱۶۔
۶۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری،''تحقیق وتنقید''،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۶۔
۶۵۔ ________،''عملی تنقیدیں''،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء،ص۷۔
۶۶۔ ایضاً،ص۷۔
۶۷۔ ایضاً،ص۸۔
۶۸۔ ایضاً۔
۶۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری،''غزل اُردو کی شعری روایت''،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء،ص۱۴۔
۷۰۔ ________،''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷ء،ص۱۰۔
۷۱۔ ________،''تنقیدی شذرات ومقالات''،الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۵،ص ن۔
۷۲۔ ________،''اردو فکشن کی مختصر تاریخ''،بیکن بکس،ملتان،۲۰۰۶ء،ص۹۔

۴۳۔ ___________،''ادب اور ادب کی افادیت''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۷۔

۴۴۔ ___________،''بلا جواز (کچھ اپنے بارے میں)''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ احمد، کلیم الدین، پروفیسر: ۱۹۸۶ء، ''فرہنگِ ادبی اصطلاحات''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

۲۔ ارم سلیم: ۱۹۸۸ء، ''اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۳۔ اشرف کمال، ڈاکٹر: ۲۰۱۵ء، ''تاریخ اصناف نظم ونثر''، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی۔

۴۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر: ۲۰۰۱ء، ''اردو تنقید کا ارتقا''، اشاعت پنجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

۵۔ بیگم، عبیدہ، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، طبع دوم، سٹی بک پوائنٹ، کراچی۔

۶۔ جعفری، محمد، سیّد: ۱۹۸۵ء، ''شوخیٔ تحریر''، مکتبۂ دانیال، کراچی۔

۷۔ سرور، آل احمد: ۱۹۷۲ء، ''تنقید کیا ہے؟''، مکتبہ جامعہ ملیہ، نئی دہلی۔

۸۔ علوی، نثار احمد، حکیم: س ن، ''سخنوارانِ کاکوری''، میخانۂ ادب، کراچی۔

۹۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء، ''ادبیات وشخصیات''، بیکن بکس، ملتان۔

۱۰۔ فتح پوری، نیاز، علامہ: ۱۹۸۷ء، ''غالب شخصیت وفن''، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۱۱۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر: ۲۰۰۱ء، ''اُردو رباعی، فنی وتاریخی ارتقاء''، مکتبۂ عالیہ، طبع چہارم، لاہور۔

۱۲۔ ___________: ۲۰۰۴ء، ''غزل اُردو کی شعری روایت''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۳۔ ___________: ۲۰۰۵ء، ''تنقیدی شذرات ومقالات''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۴۔ ___________: ۲۰۰۶ء، ''اردو فکشن کی مختصر تاریخ''، بیکن بکس، ملتان۔

۱۵۔ ___________: ۲۰۰۶ء، ''عملی تنقیدیں''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۶۔ ___________: ۲۰۰۷ء، ''ادب اور ادب کی افادیت''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۷۔ ___________: ۲۰۰۷ء، ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۸۔ ___________: ۲۰۱۱ء، ''بلا جواز (کچھ اپنے بارے میں)''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۹۔ ___________: ۲۰۱۳ء، ''تحقیق وتنقید''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۲۰۔ فیروز اللغات اُردو، فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور۔

۲۱۔ قریشی، عبدلرزاق، مرتب: ۱۹۶۲ء، ''دیوان عزلت''، ادبی پبلشرز، بمبئی۔

۲۲۔ کاظمی، محمد اصغر، سیّد، مرتب: ۲۰۰۱ء، ''تنقید نما''، جلد اوّل، فرید پبلشرز، کراچی۔

۲۳۔ ___________: س ن، ''تنقید نما''، جلد دوم، حرا فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی۔

۲۴۔ _____ :۲۰۱۳ء،''مولانا حسرت موہانی غزل گوئی کے آئینے میں''،حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)،کراچی۔
۲۵۔ محمود الٰہی، پروفیسر،مرتب:۱۹۸۸ء،''الہلال کے تبصرے''،اترپردیش اُردو اکادمی،لکھنؤ۔
۲۶۔ نجیب جمال، ڈاکٹر:۱۹۹۴ء،''کتاب کے بعد''، اظہار سنز،لاہور۔

رسائل:

۱۔ ''تحقیق''،شعبۂ اُردو،سندھ یونیورسٹی،شمارہ مشترکہ ۱۲۔۱۳،جام شورو، ۹۹۔۱۹۹۸ء۔
۲۔ ''قومی زبان''،انجمن ترقی اُردو پاکستان،کراچی،اکتوبر ۱۹۸۱ء۔

ویب گاہی:

۱۔ (http://www.webster-dictionary.org/definition/Foreword)
۲۔ (http://www.webster-dictionary.org/definition/Preface)